قرآن فہمی بذریعہ خط و کتابت کورس

گھر بیٹھے قرآن کی ابدی تعلیمات سے آگاہی اور عربی زبان کے بنیادی قواعد سیکھنے کا

نادر موقع !

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام اپنی نوعیت کے 3 منفرد

خط و کتابت کورسز میں داخلے جاری ہیں

1) قرآن حکیم کی فکری و عملی راہنمائی

قرآن کی ابدی ہدایت سے استفادے کے نقطۂ نگاہ سے یہ نہایت مفید اور مؤثر کورس ہے۔ اس کورس کے لئے اعانتی مواد مطبوعہ شکل میں بھی دستیاب ہے' مزید برآں 44 آڈیو کیسٹ کے سیٹ کی صورت میں اور کمپیوٹر CD کی صورت میں بھی اعانتی مواد فراہم کیا جا سکتا ہے۔

2) عربی گرامر خط و کتابت کورس (I' II' III)

قرآن و حدیث کی زبان یعنی عربی سے واقفیت کے لئے اس کے قواعد کو جاننا بہت ضروری ہے۔ عربی گرامر کورس مرکزی انجمن کی شائع کردہ کتاب آسان عربی گرامر کے تین حصوں پر مشتمل ہے جس میں عربی گرامر کے تقریباً تمام ضروری قواعد کا احاطہ کیا گیا ہے۔

3) ترجمہ قرآن حکیم کورس

یہ کورس خصوصی طور پر نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے ترتیب دیا گیا ہے جنہیں قرآنی الفاظ کے معانی براہِ راست سمجھائے اور یاد کرائے جاتے ہیں اور اس طرح آیاتِ قرآنی کا مفہوم سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

داخلہ کے خواہش مند حضرات پراسپکٹس کے حصول اور دیگر معلومات کیلئے درج ذیل پتے پر رجوع کریں!

ناظم شعبہ خط و کتابت کورس

قرآن اکیڈمی' 36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون : 03-5869501

وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرة : ٢٦٩)

ماهنامه

حکمتِ قرآن

لاهور

بیادگار: ڈاکٹر محمد رفیع الدین ایم اے' پی ایچ ڈی' ڈی لٹ' مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد' ایم اے' ایم فل' پی ایچ ڈی'

معاون: حافظ عاکف سعید' ایم اے (فلسفہ)

ادارۂ تحریر: حافظ خالد محمود خضر' پروفیسر حافظ نذیر احمد ہاشمی

جلد ۲۱ | ذوالحجہ ۱۴۲۲ھ - فروری ۲۰۰۲ء | شمارہ ۲

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶- کے- ماڈل ٹاؤن- لاہور ۱۴- فون: ۵۸۶۹۵۰۱

کراچی آفس: ۱۱- داؤد منزل متصل شاہ بخاری- شاہراہ لیاقت کراچی فون: ۲۱۶۵۸۶

سالانہ زرتعاون : 100 روپے

قیمت فی شمارہ : 10 روپے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!

آج پوری ملت اسلامیہ ایک عجیب بے کسی و لاچاری میں مبتلا اور اضمحلال و زبوں حالی کا شکار نظر آتی ہے۔ یہ صورت حال اس کیفیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے جس سے یہ عظیم ملت اسلامیہ گزشتہ صدی کے اوائل میں پہلی جنگ عظیم کے بعد دوچار تھی جس کا نقشہ عظیم ملی شاعر مولانا الطاف حسین حالی نے ان الفاظ میں کھینچا تھا کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے　　اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد　　دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

عالمی ملت اسلامیہ کی اسی دردناک صورت حال کا نقشہ حکیم الامت اور مفکرِ ملت علامہ اقبال نے اپنے انداز میں یوں کھینچا تھا کہ ؎

پیش ما یک عالمِ فرسودہ است　　ملت اندر خاک او آسودہ است

[ہمارے سامنے ایک گھسا پٹا فرسودہ عالم ہے جس کی خاک کے اندر ملت اسلامیہ (ذلت و رسوائی کے ساتھ) خواب غفلت میں مدہوش پڑی ہے۔]

غور طلب بات ہے کہ کیا آج بھی ملت اسلامیہ کی صورت حال کم و بیش یہی نہیں ہے ـــــ ایک ظاہری فرق ضرور ہے کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد قریباً پورا عالم اسلام سیاسی و عسکری اعتبار سے اقوامِ مغرب کی براہِ راست غلامی کے شکنجے میں تھا جبکہ آج مسلمان اقوام بظاہر آزادی کے نام پر درحقیقت فریب ذہنی کا شکار ہیں، لیکن بالواسطہ طور پر معاشی و اقتصادی لحاظ سے ہی نہیں، بہت حد تک سیاسی اعتبار سے بھی اقوام مغرب کی، جن کا سرغنہ آج امریکہ ہے، بدترین غلامی اور محکومی کا مزا چکھ رہی ہیں جس کے عبرتناک مظاہر آج ہمارے سامنے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے کے فرعون سے ہزاروں گنا نہیں لاکھوں گنا زیادہ طاقتور، جابر اور مستبد فرعونِ وقت امریکہ کے جبر اور قہر کے سامنے مسلمان اقوام کی حالت بکری کے اس ناتواں بچے سے مختلف نہیں ہے جو کسی خونخوار شیر کے رحم و کرم پر ہو۔ چنانچہ اس کی ایک غراہٹ کی تاب نہ لاتے ہوئے عالم اسلام کی واحد ایٹمی قوت پاکستان جس رسوا کن انداز میں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئی اور پھر جس وقت فرعونِ وقت کے حکم کی تعمیل میں ہم نے برادر اسلامی ملک میں اپنے ان مسلمان بھائیوں کے گلے کاٹنے میں طاغوتی قوتوں کا ساتھ دیا جنہوں نے فرعونِ وقت کی بجائے اللہ کی غلامی اختیار کرنے اور اس قادرِ مطلق کی وفاداری کا دم بھرنے کا اعلان کیا تھا، اسے اسلامی دنیا کے سیاہ ترین باب کے طور پر تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

یہی نہیں، ہم امریکہ کی کاسہ لیسی اور دریوزہ گری میں اس حد تک گر چکے ہیں کہ پاکستان میں مقیم اور پناہ گزیں غیر پاکستانی مسلمان بھائیوں کو ہی نہیں، پاکستانی شہریوں کو بھی امریکہ کے ایک اشارے پر اس کی سفاک تحقیقاتی ایجنسی ایف بی آئی کے حوالے کرنے سے دریغ نہیں کرتے۔ بالواسطہ غلامی تو پہلے بھی تھی، اب یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم نے خود برضا و رغبت بحیثیت قوم خود کو امریکہ کی تحویل میں دے دیا

(باقی ٹائٹل کے اندرونی صفحہ ۳ پر)

درس ۲۱

اہل ایمان کے لئے
ابتلاء و امتحان سے گزرنا لازمی ہے!
سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع کی روشنی میں
(۲)

نوجوانوں کا خصوصی معاملہ

مکّہ میں نبی اکرم ﷺ پر ایمان لانے والوں پر جو بدترین تشدّد ہو رہا تھا اس کا اوّلین نشانہ تو وہ لوگ بنے جو غلاموں کے طبقے سے ایمان لائے تھے لیکن اس تشدّد کا دوسرا بڑا شکار نوجوان تھے۔ یہ بات یہاں سمجھ لینی چاہئے کہ ہر دور میں کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرنے والوں میں معاشرے کے یہی دو طبقے آگے بڑھتے ہیں۔ یا تو معاشرے کے مظلوم اور پسے ہوئے طبقات کسی انقلابی دعوت کو لپک کر قبول کرتے ہیں اور یا پھر نوجوان اس میں پیش قدمی کرتے ہیں۔ اسلام کی دعوت اپنی اصل کے اعتبار سے' اپنی نوعیت کے اعتبار سے انقلابی دعوت ہے۔ اسلام کی دعوت' عام مذہبی معنی میں تبلیغ کا عمل نہیں ہے۔ یہ بدھ مت کے بھکشوؤں یا عیسائی مشنریوں کی طرح کی تبلیغ نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس کی پشت پر ایک مضبوط نظریہ ہے۔ اس نظریئے کی بنیاد پر ایک انقلاب برپا کرنا ہے' نظام تبدیل کرنا ہے' اللہ کے دین کو سربلند کرنا ہے' اس کی کبریائی کو نافذ و قائم کرنا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ اس سے پہلے عرض کیا جا چکا ہے' ایک نہایت گھمبیر انقلابی جدوجہد ہمیں نبی اکرم ﷺ کی اس تئیس سالہ

جدوجہد میں نظر آتی ہے جس کا آغاز پہلی وحی کے نزول کے ساتھ ہوا اور جو آپؐ کے وصال تک جاری رہی۔ انقلابی دعوت کے بارے میں یہ سمجھ لیجئے کہ اگرچہ اس کا رُخ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کی طرف ہوتا ہے اور وہ پس ماندہ طبقات کو اپنا اوّلین ہدف نہیں بنایا کرتی' جیسے کہ عیسائی مبشرین یا مبلغین کا عام انداز ہوتا ہے کہ پسے ہوئے اور دبے ہوئے طبقات کی دلجوئی کر کے اور کچھ ان کی خدمت کر کے' مثلاً کچھ دودھ کے ڈبے تقسیم کر کے یا ان کے علاج معالجے کا بندوبست کر کے ان کے دلوں میں اپنے لئے ایک نرم گوشہ پیدا کر لیا جائے' تاہم اس انقلابی دعوت کی طرف سب سے پہلے یہی طبقات پیش قدمی کرتے ہیں۔

انقلابی دعوت ہمیشہ ایک فکر' ایک نظریہ پیش کرتی ہے اور اسے اس کی Face Value پر قبول کرنے کی دعوت دیتی ہے۔ چنانچہ انبیاء اور رسولوں کی دعوت کا انداز ہمیشہ یہ رہا کہ وہ سوسائٹی کے اعلیٰ ترین طبقات کو سب سے پہلے مخاطب کرتے تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا گیا تو حکم ہوا: ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۞﴾ ''جاؤ فرعون کے پاس وہ بہت سرکشی دکھاتا ہے''۔ گویا پہلا تبلیغی مشن جو انہیں سونپا گیا وہ فرعون کے دربار میں دعوت پیش کرنے کے حکم پر مشتمل تھا۔ حضور ﷺ کو اُم القریٰ یعنی مکّہ میں جو بستیوں کا مرکز تھا' مبعوث کیا گیا۔ مکّہ پورے عرب کے لئے تہذیبی' مذہبی اور ثقافتی بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سیاسی صدر مقام کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپؐ جب مکّہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے تو وہاں آپؐ نے گلیوں میں کھڑے ہو کر اسلام کی صدا نہیں لگائی' دعوت و تبلیغ کے لئے پس ماندہ طبقات کو منتخب نہیں کیا بلکہ آپؐ نے طائف کے تین چوٹی کے سرداروں سے ملاقات کی اور اسلام کی دعوت ان کے سامنے رکھی! یہ بات اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ دعوت اسلامی کا مزاج عام مذہبی تبلیغ سے بالکل جدا ہے' لیکن اپنی جگہ یہ بھی حقیقت ہے کہ جو سوسائٹی کے اعلیٰ طبقات ہوتے ہیں ان کے Vested Interests ہوتے ہیں' پہلے سے موجود نظام کے ساتھ ان کے بھاری مفادات وابستہ ہوتے ہیں' مصلحتوں کی بڑی بھاری بیڑیاں ان کے پاؤں میں

پڑی ہوتی ہیں۔ ان کے لئے کسی انقلابی دعوت کو قبول کرنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تاہم ان میں بعض اوقات کچھ ایسے انتہائی سلیم الفطرت لوگ بھی ہوتے ہیں جو فوراً اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن عام طور پر جو لوگ اس دعوت کی طرف پیش قدمی کرتے ہیں ان میں ایک تو وہ لوگ شامل ہوتے ہیں جو اس معاشرے میں ویسے ہی دبے ہوئے اور پسے ہوئے ہوتے ہیں' جن کے کوئی مفادات اس نظام کے ساتھ وابستہ نہیں ہوتے کہ جو ان کے پاؤں کی بیڑیاں بن سکیں یا ان کی آنکھوں کے آگے پردہ بن کر حائل ہو سکیں' وہ اس دعوت کو Face Value پر آگے بڑھ کر قبول کرتے ہیں۔ (اس طبقے میں سے حضرت بلالؓ اور حضرت خبابؓ بن الارت کا ذکر ہو چکا ہے)۔

دوسرا طبقہ جو کسی بھی انقلابی دعوت کی طرف پیش قدمی کرتا ہے وہ نوجوانوں کا طبقہ ہوتا ہے' اس لئے کہ یہ عمر ولولوں اور امنگوں کی عمر ہوتی ہے۔ ابھی کوئی مصلحت کوشی اور مصلحت بینی ان پر مسلّط نہیں ہوئی ہوتی۔ ان کے جسم و جان میں کردار کی حرارت موجود ہوتی ہے۔ ابھی ان کا ضمیر مفادات کے مقابلے میں اتنا شکست خوردہ نہیں ہوتا کہ کسی بات کو حق سمجھنے کے باوجود اسے رد کر دے۔ چنانچہ نوجوان ہی کسی انقلابی دعوت کا ہراول دستہ بنتے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ حضور ﷺ پر بھی ایمان لانے میں قریش کے سربرآوردہ اور شرفاء کے خاندانوں میں سے نوجوانوں ہی نے پیش قدمی کی۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر یعنی teen ager تھے۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب ایمان قبول کیا تو وہ بھی عمر کے اسی دور سے گزر رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نوعمری میں اللہ نے جو امتیاز بخشا اس سے کون واقف نہیں! بلکہ ان کے بارے میں یوں کہئے کہ وہ تو پہلے ہی اپنے تھے' گھر کے فرد تھے۔ اسی طرح نوجوانوں میں سے کئی ایسے تھے جو ایمان لائے۔ ان نوجوانوں پر بھی تشدّد ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو بنو اُمیہ کے بڑے اعلیٰ گھرانے کے چشم و چراغ تھے' اگرچہ اتنے کم عمر نہیں تھے کہ انہیں teen ager قرار

دیا جا سکے' لیکن ایمان لانے پر چچا نے یہ معاملہ کیا کہ ایک چٹائی میں لپیٹ کر انہیں دھواں دے دیا کہ دم گھٹ جائے۔ ان نوجوانوں کو اس جسمانی ایذاء اور تشدّد پر مستزاد جو مسئلہ درپیش ہوا وہ یہ کہ ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ اس نئے دین کو چھوڑ دو اور آبائی دین پر واپس آ جاؤ۔

ظاہر بات ہے کہ نوجوانوں کے طبقے (teen agers) میں سے جن لوگوں نے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہا ان کے بارے میں بلاخوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ انتہائی سلیم الطبع اور سلیم الفطرت نوجوان ہوں گے۔ ان کی سلامتیٔ طبع اور سلامتیٔ فطرت ہی کا یہ بھی تقاضا تھا کہ وہ اپنے والدین کا ادب و احترام ملحوظ رکھیں اور ان کے حقوق ادا کریں۔ لہٰذا ان کے لئے یہ ایک نہایت پریشان کن مرحلہ تھا کہ وہ والدین کی اطاعت کریں اور ان کا کہا مانیں یا توحید کو اختیار کریں اور والدین کا دباؤ قبول کرنے سے انکار کر دیں۔ ادھر ان کے والدین اپنے حقوق کا واسطہ دے کر انہیں راہِ حق سے برگشتہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کا واقعہ

اس سلسلے میں ایک بڑا عجیب معاملہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آیا۔ حضرت سعدؓ عشرۂ مبشرہ میں سے ہیں اور انہی کے ہاتھوں بعد میں ایران فتح ہوا۔ یہ جب ایمان لائے تو ابھی نوعمر نوجوان تھے۔ والد فوت ہو چکے تھے' ماں نے بڑی محبت سے پالا اور بڑی محنت سے ان کی تربیت کی تھی۔ ماں اگر انتہائی محبت کرنے والی تھی تو بیٹا بھی سعادت مندی میں کم نہ تھا۔ ان کے سعادت مند اور سلیم الطبع ہونے کا ایک مظہر یہ بھی سامنے آیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان لے آئے۔ مشرک ماں نے اب اپنا پورا وزن ایک پلڑے میں ڈالا اور بیٹے پر دباؤ ڈالنے کے لئے یہ اعلان کر دیا کہ اگر سعد اپنے آبائی دین میں واپس نہ آیا تو نہ کچھ کھاؤں گی اور نہ پیوں گی' اپنے آپ کو ہلاک کر لوں گی۔ گویا آج کی اصطلاح میں ہم یوں کہیں گے کہ اس نے بھوک ہڑتال کر دی۔ آپ غور کیجئے کہ کیسی شدید ذہنی اذیّت اور سخت آزمائش سے

حضرت سعدؓ اس وقت دوچار ہوئے ہوں گے۔ یہ ہے پس منظر جس میں یہ موضوع یہاں زیرِ بحث آ رہا ہے۔

مسئلے کا حل

فرمایا: ﴿وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ حُسْنًا ..... ﴾ کہ اے نوجوانو! تمہاری فطرت کا یہ اقتضاء غلط نہیں ہے کہ والدین کا ادب ولحاظ ہونا چاہئے' یہ چیز ہم نے خود فطرتِ انسانی میں ودیعت کی ہے۔ ہم ہی نے تاکید کی ہے انسان کو کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ نیک سلوک کرے' ان کا ادب و احترام کرے اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرے۔ یہ مضمون اس منتخب نصاب میں اس سے قبل سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع میں آ چکا ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ قرآن مجید میں مضامین کا تکرار و اعادہ کے ساتھ آنا بغیر کسی حکمت کے نہیں ہوتا۔ وہاں سورۂ لقمان میں حقوق کے حوالے سے گفتگو ہو رہی تھی کہ انسان پر سب سے پہلا اور سب سے مقدم حق اللہ کا ہے ﴿يٰبُنَيَّ لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ ﴾ اس کے بعد والدین کا نمبر آتا ہے۔ گویا اللہ کے بعد سب سے بڑا حق انسان پر اپنے والدین کا ہے۔ تو وہاں یہ بحث اس حوالے سے آئی تھی کہ اگر کسی معاملے میں اللہ کا حق اور والدین کے حقوق ٹکرانے لگیں تو صحیح قابل عمل صورت کیا ہو گی!..... یہاں سورۃ العنکبوت میں معاملہ زیرِ بحث ہے کہ ایمان لانے والوں کو کن کن مسائل اور کون کون سے مخمصوں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ نوجوانوں کے لئے چونکہ بالخصوص یہ مسئلہ خصوصی اہمیت کا حامل تھا کہ ان کے والدین انہیں شرک کرنے پر مجبور کرتے تھے لہٰذا اس مضمون کا یہاں پھر اعادہ کر دیا گیا۔ فرمایا:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا﴾

یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کی ہے لیکن ہر شے کی ایک حد ہوتی ہے۔ ہر صاحبِ حق پر کوئی اور صاحبِ حق موجود ہے' اور تمام حقوق میں فائق ترین حق اللہ کا ہے۔ والدین کا حق مسلّم' لیکن ''اگر وہ تم سے جھگڑیں (اور مجبور کریں) اس بات پر کہ تم میرے ساتھ کسی ایسی ہستی کو شریک ٹھہراؤ جس کے

بارے میں تمہیں کوئی علم حاصل نہیں' تو ان دونوں کا کہا مت مانو!''

یہاں نوٹ کیجئے کہ لفظ جہاد مشرک والدین کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ ان کی یہ کوشش یعنی شرک کے حق میں اپنا دباؤ استعمال کرنا' یہ سب ان کا مجاہدہ ہے اور اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ یہ مجاہدہ فی سبیل الشرک ہے' یا یوں کہئے کہ فی سبیل الطاغوت یا فی سبیل الشیطان ہے!..... تو اگر تمہارے والدین تمہیں شرک پر مجبور کر رہے ہیں تو درحقیقت وہ اپنے حقوق سے تجاوز کر رہے ہیں' لہٰذا ان کا کہنا مت مانو!..... مزید فرمایا:

﴿اِلَیَّ مَرۡجِعُکُمۡ فَاُنَبِّئُکُمۡ بِمَا کُنۡتُمۡ تَعۡمَلُوۡنَ۝﴾

''میری ہی طرف تم سب کو لوٹنا ہے اور پھر میں تمہیں جتلا دوں گا (کھول کھول کر سامنے رکھ دوں گا) جو کچھ کہ تم کرتے رہے تھے۔''

معلوم ہوا کہ ایک تو اس طرح اس نہایت اہم مسئلے کا حل اللہ تعالیٰ نے پیش فرما دیا جو اہل ایمان میں سے نوجوان طبقہ کو درپیش تھا اور اس طرح ان کی ذہنی الجھن دور ہوئی۔

اہلِ ایمان کے لئے ایک نوید

اگلی آیت میں اہلِ ایمان کے لئے پھر reassurance ہے۔ یعنی تسلی و تشفی کا انداز اور اچھے انجام کی نوید ہے۔ یہاں ہمیں اس معاملے پر بھی خاص طور پر غور کرنا ہوگا کہ یہ اعادہ کیوں ہو رہا ہے' حالانکہ دو آیات قبل اس سے ملتا جلتا مضمون گزر چکا ہے۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِی الصّٰلِحِیۡنَ۝﴾

''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہم انہیں لازماً نیکوکاروں میں داخل کریں گے۔''

دیکھئے' ایمان کے ساتھ اس کے عملی تقاضے یعنی عمل صالح کا ذکر ایک بار پھر اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس سیاقِ کلام اور جس context (پس منظر) میں گفتگو ہو رہی ہے' اس میں ''عمل صالح'' سے کون سے اعمال مراد ہیں؟ ابھی نماز تو فرض نہیں ہوئی' روزے کا کوئی حکم ابھی آیا ہی نہیں' زکوٰۃ کا ابھی کوئی نظام سرے سے قائم نہیں ہوا' تو یہاں ''عمل صالح'' سے آخر کون سا

عمل مراد ہے! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان کا جو بھی عملی تقاضا سامنے آئے اسے پورا کرنا' ایمان پر ثابت قدمی دکھانا' رسول اللہ ﷺ کے حکم کی اطاعت کرنا کہ رسولؐ اگر یہ کہیں کہ خواہ تمہیں اذیت دے کر ہلاک کر دیا جائے تم مدافعت میں بھی ہاتھ نہیں اٹھا سکتے' جماعتی ڈسپلن کی پابندی کرنا اور دین کی دعوت و تبلیغ میں نبی ﷺ کے دست و بازو بننا' یہ سب چیزیں عمل صالح میں شامل ہیں۔ گویا ایک لفظ میں اگر ہم یوں کہیں کہ یہاں ''عمل صالح'' سے مراد ایمان کے عملی تقاضوں کی ادائیگی ہے تو یہ درست ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں عمل صالح کا جو نقشہ بنا ہوا ہے اس کا ابتدائی مکی دور میں وجود نہیں تھا! اس آیت میں ﴿لَنُدۡخِلَنَّهُمۡ فِي الصّٰلِحِيۡنَ﴾ کے الفاظ بھی خصوصی طور پر لائق توجہ ہیں: ''ہم لازماً انہیں صالحین میں داخل کر دیں گے''۔ وہی تاکیدی انداز جو آیت ۷ میں اختیار فرمایا گیا' یہاں بھی موجود ہے۔ اس آیت کا ابھی ہم نے مطالعہ کیا ہے:

﴿وَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَنُكَفِّرَنَّ عَنۡهُمۡ سَيِّاٰتِهِمۡ وَلَنَجۡزِيَنَّهُمۡ اَحۡسَنَ الَّذِىۡ كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ۝﴾

غور طلب بات یہ ہے کہ دوبارہ اس مضمون کا اعادہ کیوں ہوا! ذرا غور کریں گے تو بات واضح ہو جائے گی اور اس تکرار میں جو معنوی حسن ہے وہ سامنے آ جائے گا۔ دیکھئے' یہاں ان نوجوانوں کا معاملہ زیر بحث تھا جو اسلام لانے کی پاداش میں اپنے والدین سے کٹ رہے تھے' جنہیں اپنے رشتہ داروں سے تعلق کا ٹنا پڑ رہا تھا۔ یہاں ان کے زخمی دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے کہ تم صرف کٹے ہی نہیں ہو' کسی سے جڑے بھی ہو!..... تمہیں اس بات پر خوش ہونا چاہئے کہ اب تمہارا تعلق قائم ہوا ہے محمد رسول اللہ ﷺ اور ان کے صحابہ کے ساتھ! تم ان صالحین اور نیکوکاروں کے ساتھ ایمانی رشتے میں منسلک ہو گئے ہو۔ چنانچہ وہ صدمہ جو ایک سلیم الطبع انسان محسوس کرتا ہے کہ میں اپنے عزیزوں اور رشتے داروں سے کٹ گیا ہوں' اس کا ازالہ اس آیت سے ہو جاتا ہے۔

یہ ایک دلچسپ تاریخی حقیقت ہے کہ ابوجہل نے عین میدانِ بدر میں جو دعا مانگی

تھی تو اس میں تعلقات کے انقطاع ہی کی دہائی دی تھی۔ وہ دعا اس اعتبار سے بھی بڑی عجیب ہے کہ اس نے وہاں کسی لات' عزیٰ' ہبل یا کسی منات کو نہیں پکارا بلکہ صرف اللہ کو پکارا: ''اَللّٰھُمَّ اَقْطَعْنَا لِلرَّحِمِ فَاَھِنْهُ الْیَوْمَ'' اے اللہ جس شخص نے ہمارے رحمی رشتے کاٹ دیئے اسے آج رسوا کر دے!'' وہ دہائی دے رہا تھا محمد رسول اللہ ﷺ کے خلاف اور اس کے نزدیک آنحضور ﷺ کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ آپؐ نے باپ کو بیٹے سے جدا کر دیا' بھائی کو بھائی سے علیحدہ کر دیا' بیویوں اور شوہروں میں جدائی ڈال دی۔ اور اس طرح قریش کی قبائلی جمعیت منتشر ہو کر رہ گئی' ان کا شیرازہ پراگندہ ہو کر رہ گیا۔ یہ ہے وہ معاملہ جس کے لئے ان نوجوانوں کے دلوں پر مرہم رکھا جا رہا ہے۔ تم اگر اپنے عزیز رشتہ داروں سے کٹے ہو تو سوچو کہ نبی اکرم ﷺ اور ان کے صحابہ سے جڑے بھی ہو! تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہوئی ہے جنہیں سورۃ الفاتحہ میں ''مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ'' قرار دیا گیا ـــــ اور مُنْعَمْ عَلَیْھِمْ کون ہیں' اس کا جواب سورۃ النساء کی آیت ۶۹ میں ہے:

﴿وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْھِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ۝﴾

کہ اپنے آباء و اجداد سے اگر تم کٹ گئے' اپنے بھائی بندوں سے تمہارا تعلق منقطع ہو گیا تو ملول و غمگین نہ ہو' تمہیں ان لوگوں کی رفاقت نصیب ہو گئی ہے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے' روزِ قیامت تم انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور نیکوکاروں کے ساتھ اٹھائے جاؤ گے اور ان کے ساتھ جنت الفردوس میں تمہارا داخلہ ہو گا۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ایسے لوگوں میں شامل فرمائے! وَاَدْخِلْنَا الْجَنَّةَ مَعَ الْاَبْرَارِ' یَا عَزِیْزُ یَا غَفَّارُ!!

نفاق کا نقطۂ آغاز

اس کے بعد اب وہ مضمون آ رہا ہے جو اس سے قبل کسی قدر تفصیل کے ساتھ منافقت کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ المنافقون کے درس میں بیان ہو چکا ہے۔ یہاں یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ سورۃ العنکبوت جس کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں' مکّی

سورۃ ہے اور مکّی دَور کے بھی زیادہ سے زیادہ درمیانی عرصے میں اس کا نزول ہوا۔ اس اعتبار سے نفاق کی اس معروف صورت کا ابھی مسلمانوں کی صفوں میں کہیں دُور دُور تک نشان نہیں تھا جس کا بالعموم تصور ہمارے ذہنوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ منافق وہ ہے جو مسلمانوں کو دھوکہ دینے کی نیت سے اسلام قبول کرے' اس نے محض ظاہراً اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو' اندرونی طور پر وہ پکا کافر ہو' وغیرہ۔ مکّی دَور میں اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وہاں تو کلمۂ شہادت کا زبان پر لانا معاشرے کو چیلنج کرنے اور اس کے خلاف اعلانِ بغاوت کرنے کے مترادف تھا۔ یہ گویا ایسے ہی تھا کہ کوئی انسان خود ہر طرح کی مصیبت کو دعوت دے اور آگے بڑھ کر للکارے۔ لہٰذا اس معروف نفاق کا ابھی کہیں دُور دُور تک کوئی امکان نہیں تھا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر وہ کون سا نفاق ہے جس کا ذکر اس سورۂ مبارکہ میں ہو رہا ہے۔ یہ ہے درحقیقت وہ اصل نفاق جو کم ہمتی' بزدلی اور قوّتِ ارادی کی کمزوری سے عبارت ہے کہ اگرچہ ایمان جب قبول کیا تھا تو اس کی face value پر قبول کیا تھا' نبی ﷺ کی بات دل کو لگی تھی تبھی اسے تسلیم کیا تھا' لیکن پھر ایمان کے کٹھن تقاضے جب سامنے آنے لگے' مصائب' تکالیف اور ایذاؤں کا سامنا کرنا پڑا تو ان سے طبیعت گھبرانے لگی اور گریز کی طرف مائل ہونے لگی۔ اگر تو ان مشکلات کی وجہ سے کوئی انسان اپنی دینی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں پس وپیش کرنے لگے' دین کے راستے میں اس کے قدم رکنے لگیں اور گومگو کی سی کیفیت اس پر طاری ہو جائے تو یہی درحقیقت مرضِ نفاق کا نقطۂ آغاز ہے!

نفاق اور منافقت کا یہ نقطۂ آغاز اس آیۂ مبارکہ میں بڑی وضاحت سے سامنے آتا ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ؕ﴾

''لوگوں میں سے کچھ وہ بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اللہ پر' پھر جب انہیں ایذا پہنچائی جاتی ہے اللہ کی راہ میں (کچھ انفاقِ مال اور بذلِ نفس

یعنی جان و مال کے ایثار کا مرحلہ آتا ہے یا کوئی تکلیفیں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں) تو وہ لوگوں کی (طرف سے ڈالی ہوئی) اس آزمائش سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔''

یہ بات نوٹ کرنے کی ہے کہ اس رکوع میں فتنے کی دو نسبتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی طرف منسوب کرتے ہیں کہ ہم نے فتنے میں ڈالا ہے' ہم تم سے پہلے لوگوں کو بھی آزماتے رہے ہیں ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ اور دوسرے یہ کہ یہ فتنہ اور آزمائش لوگوں کی طرف سے ہے۔ یہ دونوں باتیں بیک وقت درست ہیں۔ اگرچہ یہ ابوجہل ہے جو مسلمانوں کو ستا رہا ہے' اور اُمیہ بن خلف ہے کہ جو تکالیف پہنچا رہا ہے' لیکن یہ بغیر اذنِ ربّ نہیں ہے۔ فاعل حقیقی اور مؤثر حقیقی تو اللہ ہے جس کے اذن کے بغیر پتّا تک جنبش نہیں کر سکتا۔ یہ دونوں چیزیں بیک وقت موجود ہیں۔ بلالؓ پر جو کچھ بیت رہا ہے عالمِ اسباب میں اس کا سبب اُمیہ بن خلف ہے۔ آلِ یاسرؓ پر جو قیامت ڈھائی جا رہی ہے اس کا ذمہ دار اس ظالمانہ عمل کا کمانے والا ابوجہل ہے لیکن فاعل حقیقی اللہ تعالیٰ ہے' آزمائش اس کی جانب سے ہے' گو اس کی یہ آزمائش ابوجہل کے ہاتھوں اور اُمیہ بن خلف ہی کے ذریعے سے اہل ایمان کو پہنچ رہی ہے۔ اس اعتبار سے فتنے کی یہ دونوں نسبتیں بیک وقت درست ہیں۔

اس آیت میں ان کم ہمت لوگوں کا ذکر ہے کہ جو لوگوں کی طرف سے ڈالی ہوئی آزمائش اور تکلیف سے ایسے گھبرا اٹھتے ہیں جیسے کہ اللہ کے عذاب سے گھبرانا چاہئے۔ ان تھڑدلے لوگوں کی سیرت کا ایک دوسرا رُخ اگلے الفاظ میں واضح کیا گیا:

﴿وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ؕ﴾

''اور اگر تمہارے ربّ کی طرف سے کوئی مدد آ جائے تو یہ ضرور کہیں گے کہ ہم یقیناً تمہارے ساتھ تھے۔''

کہ آزمائش کا وقت آتا ہے تو پیچھے ہٹتے ہیں' لیکن اگر کہیں کوئی فتح نصیب ہو جائے' اللہ کی مدد آ جائے' کوئی مال غنیمت ہاتھ لگ جائے تو وہ پیش پیش ہوں گے اور کہیں گے کہ آخر ہم بھی تمہارے ساتھ تھے' ہم بھی ان ثمرات سے متمتع ہونے کا حق رکھتے ہیں' ہمیں

بھی اس مالِ غنیمت سے میں سے پورا پورا حصّہ ملنا چاہئے۔ یہ ایک کردار ہے جو کسی ایک معیّن دَور سے متعلق نہیں ہے بلکہ ہر انقلابی تحریک کے ساتھ وابستہ ہونے والوں میں یہ کردار بھی ہوتا ہے۔

تین قسم کے کردار

ہر انقلابی دعوت اور انقلابی جدوجہد میں تین کردار بالکل نمایاں طور پر ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اِس دعوت کو ہر چہ باداباد کی شان کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

ع ''ہر چہ باداباد ما کشتی در آب انداختیم''

کہ اب جو ہو سو ہو، ہم نے کشتی پانی میں ڈال دی ہے، اب یہ تیرے گی تو ہم تیریں گے اور یہ ڈوبے گی تو ہم بھی ساتھ ہی ڈوبیں گے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اس انقلابی جدوجہد اور اس کے مقصد (cause) کے ساتھ ذہناً اور عملاً پورے طور پر وابستہ ہوتے ہیں۔ دوسری قسم کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو اس نظامِ کہنہ اور نظامِ باطل کو بچانے کے لئے میدان میں آتے ہیں اور کھلم کھلا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو پورے طور پر اس باطل نظام کے ساتھ وابستہ کرتے ہیں اور اس کے حمایتی بن کر کھڑے ہوتے ہیں کہ جو پہلے سے قائم ہے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ ایک دوسرے کے مدمقابل آتے ہیں اور اس طرح کشمکش و کشاکش کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسی کا نام مجاہدہ ہے اور اس کشاکش میں بالعموم جنگ و قتال کی نوبت بھی آتی ہے۔ ایک تیسرا عنصر درمیان درمیان میں رہتا ہے۔ وہ اس فیصلہ کن انداز میں بازی کھیلنے کا قائل ہی نہیں، اس لئے کہ اسے ہر حال میں اپنے مفادات عزیز ہیں۔ قرآن حکیم میں ایسے شخص کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا: ﴿لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ﴾ کہ نہ وہ اِدھر اپنے آپ کو وابستہ اور identify کرنے پر آمادہ ہے، نہ اُدھر یکسو ہو کر ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہے بلکہ وہ ان کے بین بین رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اس بات کا انتظار کرتا ہے کہ دیکھیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس کی حکمت عملی یہ ہوتی ہے کہ دونوں پارٹیوں کے ساتھ روابط رکھے تاکہ جس کسی کو بھی فتح نصیب ہو وہ ان کے پاس جا کر اپنی

وفاداری یا اپنی سابقہ خدمات کا حوالہ دے کر اپنے لئے تحفظات اور مراعات حاصل کر سکے۔ یہ ہے وہ منافقانہ کردار جس کو خوب اچھی طرح پہچاننے کی ضرورت ہے! اسی کردار سے پیشگی متنبہ کیا جا رہا ہے کہ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ فَاِذَآ اُوْذِيَ فِي اللّٰهِ جَعَلَ فِتْنَةَ النَّاسِ كَعَذَابِ اللّٰهِ ۭ وَلَىِٕنْ جَاۗءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ لَيَقُوْلُنَّ اِنَّا كُنَّا مَعَكُمْ ۭ﴾

کہ یہ دراصل اس مرض اور قلبی روگ کا نقطۂ آغاز ہے جو آگے بڑھ کر منافقت کی صورت میں ڈھل جاتا ہے۔ آگے فرمایا:

﴿اَوَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِمَا فِيْ صُدُوْرِ الْعٰلَمِيْنَ﴾

''تو کیا اللہ تعالیٰ زیادہ باخبر نہیں ہے اس سے کہ جو کچھ جہان والوں کے سینوں میں پنہاں ہے؟''

جہان والوں کے سینوں کے پوشیدہ اسرار سے اللہ سے بڑھ کر کون واقف ہوگا؟ یہ لوگ اپنی غلط بیانی سے کسے دھوکہ دینا چاہتے ہیں' کس کو فریب دینا چاہ رہے ہیں!! سورۃ البقرۃ کی آیت نمبر ۹ میں اس فریب کاری کا پردہ چاک کر دیا گیا:

﴿يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ .....﴾

''کہ یہ دھوکہ دینا چاہتے ہیں اللہ کو اور اہل ایمان کو' درآنحالیکہ یہ دھوکہ نہیں دے رہے مگر خود اپنے آپ کو.....''

سیدھی سی بات ہے کہ اگر تو معاملہ اللہ کے ہاتھ ہے تو وہ کھلے اور چھپے کا جاننے والا ہے' وہ تو لوگوں کے سینوں میں پوشیدہ باتوں سے بھی بخوبی آگاہ اور ان کی نیتوں اور ارادوں سے بھی خوب اچھی طرح واقف ہے۔

جھوٹا مدعیٔ ایمان کون؟

اور اب اگلی آیت کے مطالعے سے پہلے ذرا ذہن میں لائیے آیت ۳ کا آخری حصہ' جس کا ہم مطالعہ کر چکے ہیں: ﴿فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ﴾ کہ اللہ بالکل کھول کر رکھ دے گا' ظاہر کر دے گا کہ کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔ وہاں سچے اور جھوٹے سے حقیقتاً جو مراد تھی یہاں اس پر سے پردہ اٹھا دیا گیا

﴿وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبِعُوْا سَبِيْلَنَا وَلْنَحْمِلْ خَطٰيٰكُمْ﴾

''اور کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا (جو کفر کی روش پر قائم تھے) ان لوگوں سے کہ جو ایمان لائے تھے کہ اتباع کئے جاؤ ہمارے ہی راستے کا اور ہم اٹھالیں گے تمہاری خطاؤں کا بوجھ۔''

یہ نوجوانوں کو بہکانے اور ورغلانے کا ایک انداز تھا جو قوم کے ان بڑے بوڑھوں نے اختیار کیا جو خود شرک پر قائم تھے۔ وہ بڑے مشفق اور خیر خواہ بن کر ان نوجوانوں سے کہ جو نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے' یہ کہتے تھے کہ بالکل بے فکر ہو کر چلے آؤ اپنے آباء و اجداد کے راستے پر' آنکھیں بند کر کے ہمارے پیچھے چلتے رہو' ہماری پیروی کرتے رہو' ہم ہی حق پر ہیں' آخر اپنے آباء و اجداد کے راستے کو کیوں ترک کرتے ہو!! پھر مزید ترغیب کے طور پر اتمامِ حجت کے انداز میں وہ کہتے تھے کہ اگر واقعی تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے آباء و اجداد کا یہ راستہ غلط ہے اور تمہاری سمجھ میں ہماری بات نہیں آ رہی تو بھی ذرا سوچو کہ اگر تمہاری ساری ذمہ داری ہم اٹھالیں تو پھر تمہارے لئے تشویش کا کون سا معاملہ باقی رہ جاتا ہے؟ مطمئن رہو' ہم خدا کے ہاں تمہاری طرف سے جواب دہی کریں گے' تمہاری ذمہ داری ہم قبول کریں گے۔ اگر فی الواقع ہم غلطی پر ہوئے تو بھی گھبراؤ نہیں' تمہاری خطاؤں کا بوجھ ہماری گردنوں پر ہوگا۔ فرمایا:

﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ﴾

''اور نہیں ہیں وہ اٹھانے والے ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی۔ بلاشبہ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔''

وہاں تو ہر ایک کو اپنی جواب دہی کرنی ہے' کوئی کسی کا بوجھ اٹھانے والا نہیں۔ یہ سراسر جھوٹ بول رہے ہیں' دوسروں کو فریب دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہاں جس شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی ہے اور اگلی آیت میں جس طرح اللہ تعالیٰ کا غضب اُن پر ظاہر ہو رہا ہے' اس کے پس منظر میں ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے اس طرزِ خطاب میں اور فریب آمیز طرزِ تکلم میں واقعتاً کچھ لوگوں کے لئے کچھ وزن تھا۔ آخر جب قوم کے بڑے بوڑھے کوئی بات اپنے تجربے کے حوالے سے کہتے ہیں تو ان

کی بات بالعموم توجہ سے سنی جاتی ہے۔ دعوتِ حق پر کان دھرنے والے نوجوانوں پر اثر انداز ہونے کے لئے بزرگانِ قوم کی گفتگو کا انداز ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ میاں ہم نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے' ہم نے دنیا دیکھی ہے' تم ابھی نوعمری کے دَور میں ہو' تمہیں اپنے نفع ونقصان کی ابھی سمجھ نہیں ہے' کوئی سرپھرا شخص ہے جو تمہیں غلط راستے پر ڈال رہا ہے' وہ تمہاری دنیا برباد کر کے رکھ دے گا' ہمارے راستے پر آ ؤ! ہم تمہاری رہنمائی کریں گے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو ان کی طرف سے سننے میں آتی ہیں اور اس بات کا امکان ہر دم رہتا ہے کہ کسی وقت انسان اگر کسی خاص کیفیت میں ہو اور ان بزرگوں کے ساتھ اس کے حسنِ ظن کا رشتہ برقرار ہو تو وہ ان سے کوئی اثر قبول کر لے۔ لہٰذا پوری شدت کے ساتھ ان کے دعوے کی نفی کی گئی اور ان کے فریب کا پردہ چاک کر دیا گیا کہ ﴿اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ ''بلاشبہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں!'' دروغ گوئی سے کام لے رہے ہیں!!

اپنا بوجھ خود اٹھانا ہوگا

اس دورِ زوال میں جبکہ بہت سے دینی تصورات مسخ ہو گئے ہیں' ہمارے ذہنوں میں بالعموم یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ روزِ محشر کوئی وہاں ہمیں چھڑا لے گا اور ہمارا بوجھ اٹھا لے گا' کسی کے دامن سے وابستہ ہو کر نکل جائیں گے اور اس طرح ہمارا بیڑا پار ہو جائے گا۔ یہ تمام تصورات ایک طرف رکھئے اور قرآن مجید کا انداز دیکھئے! ﴿وَمَا هُمْ بِحٰمِلِيْنَ مِنْ خَطٰيٰهُمْ مِّنْ شَيْءٍ ؕ﴾ ''اور وہ ان کی خطاؤں میں سے کچھ بھی اٹھانے والے نہیں ہوں گے''۔ جیسے ایک جگہ فرمایا: ﴿لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ ''کوئی کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے والا نہ ہوگا''۔ وہاں تو اپنی اپنی گٹھڑی ہوگی اور اپنا اپنا کاندھا۔ ہر ایک کو اپنے بوجھ خود اٹھانے پڑیں گے۔ ہر شخص کو اپنی جواب دہی خود کرنی ہوگی: ﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا﴾ قیامت میں ہر شخص کو اپنی انفرادی حیثیت میں پیش ہونا ہوگا اور اسی اعتبار سے اس کا محاسبہ ہوگا کہ تم کیا تھے؟ کہاں تھے؟ تمہاری صلاحیتوں کا مصرف کیا ہوا؟ تمہیں ہم نے جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت عطا فرمائی تھی اس

سے کتنا کچھ فائدہ اٹھایا؟ یہ دلیل وہاں ہرگز قبول نہیں ہوگی کہ ہم نے تو اپنے بزرگوں کے نقش قدم کی پیروی کی تھی' اگر ہم غلطی پر تھے تو اس کے ذمہ دار ہمارے بڑے بزرگ ہیں' ہم نہیں ہیں!!

اضافی بوجھ اٹھانے والے!

اب اگلی آیت پر اپنی توجہ مرکوز کیجئے! مشرکین کے اس گھناؤنے کردار پر اللہ کا غضب بہت نمایاں ہے:

﴿وَلَيَحْمِلُنَّ اَثْقَالَهُمْ وَاَثْقَالًا مَّعَ اَثْقَالِهِمْ ۫﴾

''یہ لوگ لازماً اٹھائیں گے اپنے بوجھ' اور اپنے بوجھوں کے ساتھ اور کچھ بوجھ بھی (انہیں اٹھانے ہوں گے)''

نوجوانوں کو فکری طور پر داغ دار کرنے اور گمراہ کرنے کی یہ کوشش' ان کو غلط راستے پر ڈالنے کی یہ سعی یقیناً ان کے اپنے گناہوں کے بوجھ میں اضافے کا باعث بنے گی۔ اس سے ان کی ذمہ داری بلاشبہ بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ نوجوان جو ان کے فریب میں آ کر اپنی منزل کھوٹی کر رہے ہیں اپنی ذمہ داری سے دستکش ہوسکیں گے اور بازپُرس سے بچ جائیں گے۔ نہیں' ان کی ذمہ داری میں ہرگز کمی نہیں آئے گی۔ انہیں اپنے فیصلے کی پوری ذمہ داری قبول کرنی پڑے گی۔ یہ دلیل کہ کسی نے مجھے اس گمراہی کے راستے پر ڈالا' اللہ کے ہاں کوئی وزن نہیں رکھتی۔ ہر شخص کو جو کچھ دیا گیا ہے' جو جسمانی صلاحیتیں اور ذہن وفکر کی قوتیں عطا کی گئی ہیں' ان کی بنیاد پر وہ خود انفرادی حیثیت میں مسئول ہے۔ ہاں وہ لوگ جو دوسروں کو گمراہ کرنے اور انہیں غلط راستے پر ڈالنے کی سعی کر رہے ہیں' اپنے اس طرزِ عمل سے اپنے بوجھ میں مسلسل اضافہ کر رہے ہیں' انہیں اپنی خطاؤں کے ساتھ ان لوگوں کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھانا ہوگا جو ان کی باتوں میں آ کر گمراہی کا شکار ہو گئے تھے' یہ اضافی بوجھ بھی ان کے سروں پر ہوگا! یہ آیت مبارکہ ان الفاظ پر ختم ہو رہی ہے:

﴿وَلَيُسْئَلُنَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَمَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ﴾

''اور لازماً ان سے بازپُرس ہو کر رہے گی قیامت کے دن اس افترا کے بارے میں جو وہ کرتے ہیں۔''

جو جھوٹ یہ گھڑ رہے تھے' جو افترا پردازیاں کر رہے تھے اور جو غلط دعوے کر رہے تھے کہ ہم تمہارا بوجھ اٹھائیں گے' اس سب کے بارے میں انہیں جواب دہی کرنی پڑے گی۔ ان سے اس معاملے میں بازپُرس ہو کر رہے گی!

پہلے رکوع کے مضامین کا اجمالی تجزیہ

آپ نے دیکھا کہ اگر سلسلۂ کلام معیّن ہو جائے' سیاق و سباق واضح ہو جائے کہ کن حالات میں گفتگو ہو رہی ہے' اس وقت کیا مسائل درپیش تھے' اور کون لوگ ہیں جن کی طرف روئے سخن ہے تو قرآن مجید کی ایک ایک آیت کس طرح خود بولتی ہے اور کس طرح اس کی آیات کے مابین ایک ربط اور تعلق قائم ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے کہ یہ ایک مربوط اور مسلسل کلام ہے۔ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ قرآن مجید کا نزول ایک خاص قوم کے مابین ایک خاص ماحول میں ہوا ہے۔ اس کے نزول کے ساتھ ساتھ ایک خاص جماعت تیار ہو رہی تھی جسے جہاد فی سبیل اللہ کے لئے ایک منظم قوت کے طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ قرآن حکیم ان کے احساسات اور ان کے مسائل و معاملات کو وقتاً فوقتاً' وقفے وقفے سے زیر بحث لاتا ہے۔

سورۃ العنکبوت کے پہلے رکوع میں ان مسائل و مشکلات' ان امتحانات' ان آزمائشوں' ان تکالیف اور مصیبتوں کے ضمن میں ایک مکمل ہدایت نامہ موجود ہے کہ ان کے بارے میں اہل ایمان کا نقطۂ نظر کیا ہونا چاہئے۔ چنانچہ ان پر واضح کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہارے ایمان کی آزمائش ہے۔ تمہارے ایمان کی صداقت کا ثبوت اسی سے مہیا ہو گا۔ یہ امتحان تمہارے جذبۂ ایمانی کی تربیت کے لئے بھی مطلوب ہے۔ اور یہ آزمائش اصلاً اللہ کی طرف سے ہے' اگرچہ بظاہر یہ اللہ کے دشمنوں کے ہاتھوں تم تک پہنچ رہی ہے۔ اور پھر یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہیں ایذائیں دے کر وہ بری ہو جائیں گے' ان کو لازماً

پکڑا جائے گا۔ ابھی اللہ کی حکمت میں ان کی رسّی دراز کرنا ہے۔ وہ تمہیں اُس وقت تک ستا سکیں گے جب تک اللہ چاہے گا۔ اور ایک وقت لازماً آئے گا کہ وہ اللہ کی گرفت میں آئیں گے ﴿اِنَّ بَطْشَ رَبِّکَ لَشَدِیْدٌ﴾ ''تمہارے ربّ کی پکڑ بہت سخت ہے''۔ اگر انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ اس سے بچ نکلیں گے تو بڑا غلط فیصلہ کیا ہے۔ پھر ایمان کی حقیقت بھی بیان فرما دی گئی اور ایمان اور عمل صالح کے تقاضے پورے کرنے والوں کے لئے بہترین اجر کی بشارت بھی دی گئی۔ یہ سب کچھ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو صبر کی تلقین ہی تو ہے۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا نقطۂ آغاز سورۃ العصر ہے' جس میں ایمان اور عمل صالح کے ساتھ ساتھ تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کو بھی لوازمِ نجات میں سے شمار کیا گیا ہے:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ۝﴾

سورۃ العنکبوت کا یہ مقام دراصل ''تواصی بالصبر'' کے لئے انتہائی خوبصورت افتتاحی سبق ہے۔ یہاں تواصی بالصبر کا فریضہ گویا اللہ تعالیٰ خود سرانجام دے رہے ہیں۔ اہل ایمان کو صبر و ثبات کی تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے قول پر ڈٹے رہو' جمے رہو' اپنے دعوائے ایمان میں اس طور سے ثابت قدم رہو کہ تمہارے پائے ثبات میں کہیں کوئی لرزش نہ آنے پائے۔

رکوع ۲ تا ۴ کے مضامین کا مختصر جائزہ

یہ سورۂ مبارکہ ایک خاص پہلو سے انہی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب میں اس کا تو امکان نہیں ہے کہ سات رکوعوں پر مشتمل اس پوری سورۂ مبارکہ کا درس شامل کیا جا سکے' تاہم پہلے رکوع کے علاوہ ہم اس کی مزید چند آیات کا مطالعہ بھی کریں گے۔ دوسرے' تیسرے اور چوتھے رکوع میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء و رُسل کے حالات سے استشہاد فرمایا ہے۔ گویا کہ مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ تم پہلی اُمت نہیں ہو' نہ محمد ﷺ اللہ کے پہلے رسول ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاحقاف میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا

گیا: ﴿قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ﴾ یعنی اے نبیؐ! کہہ دیجئے کہ مَیں کوئی نیا نویلا رسول نہیں ہوں۔ بہت سے رسول آپؐ سے پہلے آئے ہیں۔ یا جیسے سورۂ آل عمران میں فرمایا گیا: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾ یعنی ''محمد (ﷺ) ایک رسول ہی تو ہیں اور آپؐ سے پہلے بہت سے رسول گزر چکے ہیں''۔ ان رسولوں کے ساتھ بھی یہ تمام حالات پیش آئے۔ ان پر ایمان لانے والوں کو بھی ان تمام گھاٹیوں سے گزرنا پڑا اور وہ ان تمام آزمائشوں کے مراحل سے دوچار ہوئے۔ چنانچہ ایک ایک کا نام لے کر بہت سے انبیاء و رُسل کا تذکرہ کیا گیا۔ سب سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا اور اس ضمن میں خاص طور پر یہ بات نمایاں کی گئی کہ ان کی استقامت بے مثل تھی کہ انہوں نے ساڑھے نو سو برس اپنی قوم میں گزارے۔ مسلسل اعراض، مسلسل انکار، استہزاء اور تمسخر سے ان کا سابقہ رہا، لیکن ہمارا وہ بندہ ثابت قدم رہا۔

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی داستان آتی ہے۔ کون سی آزمائش ہے جس سے آپؑ نہیں گزرے۔ گھر سے انہیں نکالا گیا۔ مشرک باپ نے زجر و ملامت کے انداز میں ان سے کہا: ﴿لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا﴾ یعنی ''اے ابراہیم! اگر تم (میرے ان خداؤں کی مخالفت سے) باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا اور یہ کہ تم فی الفور میری نگاہوں سے دُور ہو جاؤ!'' پھر کون سا ایسا کٹھن مرحلہ ہے جو ان پر نہیں گزرا۔ بادشاہِ وقت کے دربار میں پیشی ان کی ہو رہی ہے، آگ کے الاؤ میں وہ جھونکے جا رہے ہیں، اپنا وطن خیر باد کہہ کر پوری زندگی ایک مسافرت کے عالَم میں وہ بسر کر رہے ہیں۔ آج یہاں ہیں، کل وہاں ہیں، کبھی شام کے بالائی علاقے میں ہیں، کبھی فلسطین میں آ کر ڈیرے لگائے ہیں تو کبھی مصر میں ہیں۔ حجاز میں دعوتِ توحید کا ایک مرکز تعمیر کیا ہے۔ دوسرے بیٹے کو فلسطین میں بٹھا دیا ہے۔ اللہ کا یہ بندہؑ اپنے اس یقین پر قائم ہے کہ اس کا تعلق اپنے گھر والوں سے نہیں، آباء و اجداد سے نہیں، کسی زمین سے نہیں، کسی وطن سے نہیں، اس کا تعلق صرف اور صرف خدائے واحد کے ساتھ

ہے۔ اللہ کا وہ بندہ (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اس آخری امتحان سے بھی گزرا کہ عین بڑھاپے کے عالم میں دعائیں مانگ مانگ کر جو اکلوتا بیٹا لیا تھا اللہ نے اس کے ضمن میں بھی آزمالیا کہ کہیں اس کی محبت ابراہیمؑ کے دل میں میری محبت سے زیادہ تو نہیں ہو گئی۔ تو یہ آزمائش اور امتحان تو اس راہ کا ایک مستقل ضابطہ اور قانون ہے' اس میں کوئی استثناء نہیں ہے' جو ادھر آئے گا آزمایا جائے گا۔ یہاں انبیاء و رُسل کے حالات کا ذکر گویا ﴿وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ﴾ کی تفسیر ہے۔

اہل ایمان کے لئے خصوصی ہدایات

انبیاء اور رُسل کے احوال بیان کرنے کے بعد پانچویں رکوع میں آیت نمبر ۴۵ سے کہ جہاں سے اکیسویں پارے کا آغاز ہوا ہے' ایک نہایت اہم مضمون شروع ہوتا ہے کہ اس قسم کے حالات میں اہل ایمان کو کرنا کیا چاہئے۔ اس ضمن میں بعض معین ہدایات مسلمانوں کو دی جا رہی ہیں۔ اجمالاً یہاں اس میں سے صرف چند آیات کا حوالہ دینا مفید رہے گا۔ ظاہر بات ہے کہ اس پوری عبارت کو جو تین رکوعوں پر مشتمل ہے' ہم اس مختصر نصاب میں شامل نہیں کر سکتے۔ اس سلسلے کی پہلی ہدایت اکیسویں پارے کے بالکل آغاز میں وارد ہوئی ہے:

﴿اُتْلُ مَا اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنَ الْكِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ ۭ وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تَصْنَعُوْنَ﴾

''(اے نبیؐ!) تلاوت کیا کرو اس کی جو وحی کیا گیا ہے تمہاری جانب کتابِ الٰہی میں سے اور نماز قائم رکھو' یقیناً نماز برائی سے اور بے حیائی سے روکنے والی ہے۔ اور اللہ کا ذکر سب سے بڑی چیز ہے۔ اور اللہ جانتا ہے جو کچھ کہ تم کر رہے ہو۔''

یہ وہی مضمون ہے جو سورۃ المنافقون میں ہم پڑھ چکے ہیں' یعنی ذکر الٰہی کا التزام۔ اس کٹھن راستے میں ہمدم' غم خوار' پشت پناہ اور ہمت بندھانے والا اگر کوئی ہے تو وہ اللہ کا ذکر ہے۔ وہاں فرمایا گیا تھا کہ:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ

یَّفۡعَلۡ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ﴿۱۰﴾

''اے مسلمانو! دیکھنا تمہارا مال اور تمہاری اولاد کہیں تمہیں اللہ کی یاد سے غافل نہ کر دیں۔ اس لئے کہ جو اس فتنے میں گرفتار ہو گیا تو وہی ہے خسارہ پانے والا۔''

یہاں فرمایا کہ مشکل اور کٹھن حالات میں تمہارے لئے اصل سہارا تلاوتِ قرآن اور ادائے صلوٰۃ ہے' اور یہ دونوں ذکر کی اعلیٰ ترین صورتیں ہیں۔ قرآن حکیم مجسم ذکر ہے۔ یہ ''الذکر'' بھی ہے اور ''ذکریٰ'' بھی! اس کی تلاوت پر کاربند رہنا' اس کو پڑھتے رہنا ذکر کی نہایت عمدہ صورت ہے۔ پھر یہ کہ جامع ترین ذکر ہے نماز۔ اس میں ذکرِ قولی بھی ہے اور ذکرِ عملی بھی۔ اس میں اپنی زبان سے اللہ کو یاد کرنا بھی ہے اور اس کے سامنے اظہارِ بندگی کے طور پر جھک جانا یعنی رکوع اور سجود بھی ہے۔ فرمایا: ﴿وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ﴾ کہ اس راہ میں ہمت بندھانے والی اور ثابت قدم رکھنے والی سب سے بڑی چیز بلاشبہ ''اللہ کی یاد'' ہے۔

اس سلسلے کی دوسری اہم ہدایت اس سلسلۂ کلام میں ذرا آگے چل کر وارد ہوئی ہے۔ یہ آیت نمبر ۵۶ ہے جس میں ہجرت کی طرف اشارہ بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿یٰعِبَادِیَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنَّ اَرۡضِیۡ وَاسِعَۃٌ فَاِیَّایَ فَاعۡبُدُوۡنِ﴿۵۶﴾﴾

''اے میرے وہ بندو جو ایمان لائے ہو! میری زمین بہت کشادہ ہے' پس تم صرف میری بندگی کرو۔''

کہ اگر کسی ایک مقام پر تمہارے لئے توحید پر کاربند رہنا ناممکن بنا دیا گیا ہو تو تم اس زمین کے ساتھ بندھے نہ رہو' وہ شہر' وہ ملک یا وہ خطۂ ارضی تمہارے قدموں کو روک نہ لے' باندھ نہ لے' بلکہ تم ہجرت کر جاؤ۔ اس لئے کہ بہرصورت تمہیں بندگی میری ہی کرنی ہے۔ اس آیۂ مبارکہ میں گویا کہ مسلمانوں کو ہدایت دے دی گئی اور صاف الفاظ میں اشارہ کر دیا گیا کہ اگر مکّہ کی سرزمین تم پر تنگ ہو گئی ہے اور یہاں رہ کر توحید پر کاربند رہنا تمہارے لئے مشکل بنا دیا گیا ہے تو اس سرزمین کو خیرباد کہو اور ہجرت کر جاؤ۔ درحقیقت اسی ہدایت اور رہنمائی کے تحت ہجرتِ حبشہ واقع ہوئی۔ نبی اکرم ﷺ نے اہل ایمان کو یہ اجازت دی کہ وہ مکّہ سے چلے جائیں اور حبشہ میں جا کر پناہ گزین

ہو جائیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے دو قافلے حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی ان ہجرت کرنے والوں میں شامل تھے۔ اس سورۂ مبارکہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاص طور پر جو ذکر آیا ہے' جس طریقے سے ان کی زندگی مسلسل مہاجرت میں گزری ہے' یہ حکم گویا اسی کا ایک عکس ہے۔ آگے فرمایا:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا تُرْجَعُونَ ﴿٥٧﴾﴾

''ہر ایک کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے' پھر تم سب ہماری طرف لوٹائے جاؤ گے۔''

کہ یہ زندگی عارضی ہے' تکلیفوں اور مشقتوں میں بھی بیت جائے گی اور آرام و آسائش کے ساتھ بھی بہر حال ختم ہو کر رہے گی۔ پھر تم سب ہماری طرف لوٹا دیئے جاؤ گے۔ موت کا خوف اگر ہجرت کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے تو اسے ذہن سے جھٹک دو' موت تو بہر صورت آ کر رہے گی۔

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُبَوِّئَنَّهُمْ مِنَ الْجَنَّةِ غُرَفًا تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا ۚ نِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ ﴿٥٨﴾﴾

پھر دیکھئے وہی مؤکد وعدہ جو پہلے رکوع میں دو مرتبہ آیا تھا' یہاں سورۃ کے آخری حصے میں بھی موجود ہے: ''اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے (یعنی ایمان کے عملی تقاضوں کو پورا کیا) ہم لازماً ان کو ٹھکانہ دیں گے جنت کے بالا خانوں میں''۔ نوٹ کیجئے' ہجرت کے ساتھ اس لفظ ''لَنُبَوِّئَنَّهُمْ'' کی بڑی مناسبت ہے۔ بَوَّءَ. يُبَوِّءُ کے معنی ہیں کہیں ٹھکانہ فراہم کرنا۔ ''ہم ان کے لئے ٹھکانہ بنائیں گے جنت کے ان بالا خانوں میں (بہشت کے ان جھروکوں میں) جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی' اور کیا ہی عمدہ ہے یہ بدلہ عمل کرنے والوں کا''۔ اور یہ عمل کرنے والے کون ہیں؟ ساتھ ہی واضح فرمایا: ﴿الَّذِينَ صَبَرُوا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ ﴿٥٩﴾﴾ وہ لوگ جنہوں نے صبر کی روش اختیار کی' جو ثابت قدم رہے' نہ کسی تشدد اور مخالفت سے بددل ہوئے نہ کسی لالچ اور temptation سے انہوں نے اپنی منزل کھوٹی کی۔ ان کا توکل صرف اپنے ربّ پر تھا' ان کی تمام امیدیں صرف اسی کی ذات سے وابستہ رہیں اور وہ اسی کی پکڑ سے ڈرتے رہے!

اللہ تعالیٰ کی طرف سے نوید جانفزا

یہ سورۂ مبارکہ ختم ہوتی ہے ایک ایسی نوید جانفزا پر جو ہر اُس بندۂ مؤمن کے لئے ہے کہ جو اِس قسم کی کسی کشمکش میں عملاً مبتلا ہو اور صبر و مصابرت کے ان امتحانات سے اور آزمائشوں اور تکالیف کے اس دَور میں سے گزر رہا ہو۔ ایسے شخص کے لئے اس سے بڑی نوید جانفزا اور اس سے زیادہ قطعی یقین دہانی کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی۔ فرمایا:

﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾

''اور وہ لوگ جو ہماری راہ میں جہاد کریں گے ہم ان کے لئے اپنے راستے کھولتے جائیں گے۔ اور بے شک اللہ خوب کاروں کے ساتھ ہے۔''

پھر نوٹ کیجئے لفظ ''جہاد'' مکّی سورت میں وارد ہوا ہے جب کہ ابھی قتال کا دُور دُور تک کہیں کوئی سوال نہیں تھا۔ یہ مجاہدہ' یہ کشمکش اور یہ تصادم درحقیقت نظریات کی سطح پر ہو رہا ہے۔ صبر کا صبر کے ساتھ مقابلہ ہو رہا ہے۔ وہ لوگ اپنے نظامِ باطل کے تحفظ میں اپنی قوّتوں کو مجتمع کر رہے ہیں' یہاں اہل ایمان ہیں جو اپنے ایمان کے لئے' اپنے ربّ کے کلمے اور اس کے دین کی سربلندی کے لئے جان توڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ دینِ حق کے ان سرفروشوں سے ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ دیکھئے' یہاں تاکید کا وہی آخری اسلوب ہے۔ اس سورۂ مبارکہ کے شروع میں بھی یہ صیغۂ تاکید بتکرار آیا ہے اور یہاں آخر میں پھر یہ اسلوب اختیار کیا گیا: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''ایسے لوگوں کے لئے ہم لازماً اپنے راستے کھولتے چلے جائیں گے''۔ یہ ایک بہت اہم بات ہے' بہت اعلیٰ اور عمدہ وعدہ ہے جو مسلمانوں سے کیا جا رہا ہے۔ قدم بڑھاؤ تو سہی' آگے کی منزلوں کے بارے میں زیادہ فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں' اللہ تمہاری انگلی پکڑ کر تمہیں اپنے راستے پر چلائے گا' تمہارے لئے وہاں سے راستے کھولے گا جہاں سے کوئی راستہ کسی کو نظر نہ آتا ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت پر نگاہ ڈالئے' ہجرت سے قبل سن دس گیارہ نبوی میں بالکل ایسے محسوس ہوتا تھا کہ جیسے کہیں کوئی راستہ دُور دُور تک نظر نہ آ رہا ہو۔ مکّہ سے مایوس ہو کر آپؐ طائف تشریف لے گئے۔ وہاں جو کچھ ہوا اور جس

طور سے ہوا وہ سب کے علم میں ہے۔ زبانی مخالفت پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا' آپؐ پر پتھراؤ بھی کیا گیا' یہاں تک کہ جسمِ اطہر لہولہان ہو گیا۔ واپس آئے تو مکّہ میں حالات اس درجے مخدوش تھے کہ ایک مشرک کی امان لے کر مکّہ میں داخل ہوئے' اس لئے کہ آپؐ کے قتل کی سازش تیار ہو چکی تھی' تمام راستے گویا بند ہو چکے تھے' امید کی کوئی کرن دُور دُور نظر نہیں آتی تھی' لیکن اللہ تعالیٰ نے گھر بیٹھے راستہ کھول دیا۔ مدینہ منورہ سے چھ افراد آئے اور ایمان لے آئے۔ اگلے سال بارہ آئے' بیعت ہو گئی۔ اس سے اگلے سال بہتر (۷۲) یا چھتر (۷۵) افراد آئے اور مشرف باسلام ہو گئے۔ گویا مدینہ منورہ کا دارالہجرت بننا مقدر ہو رہا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے لئے ٹھکانہ اور جائے پناہ بنانے کا فیصلہ صادر فرما چکا ہے۔ وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے قدم ہائے مبارک ابھی پہنچے بھی نہیں لیکن آپؐ کے استقبال کی وہاں تیاریاں ہو رہی ہیں اور ایمان کو تمکن حاصل ہو چکا ہے۔ یہ ہے اللہ کا وہ پختہ وعدہ جس کا عملی ظہور اس صورت میں ہوا۔ بندۂ مؤمن کا فرض یہ ہے کہ اپنے حالات کے مطابق جو کچھ وہ کر سکتا ہے کر گزرے' نتائج کو اللہ کے حوالے کرے۔ آئندہ کہاں سے راستہ نکلے گا' اس کے بارے میں اسے خود فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اللہ نے یہ چیز اپنے ذمے لے لی ہے: ﴿لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا﴾ ''اور ہم لازماً کھولتے چلے جائیں گے ان کے لئے اپنے راستے!''

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ ربّ العالمین ○○

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے بعض ذاتی اور مالی و معاشی کوائف پر مشتمل

حسابِ کم و بیش

کا نیا ایڈیشن جسے update کرنے کی خاطر امیر تنظیم کی چار صفحات پر مشتمل ایک تازہ تحریر ''پس نوشت'' اور نائب امیر کا تحریر کردہ مختصر ''ضمیمہ'' کا اضافہ کر دیا گیا ہے'

دبیز سفید کاغذ' صفحات 68' عمدہ طباعت' قیمت فی نسخہ -/15 روپے

''حیرت انگیز قرآن''(۲)

تحریر: گیری ملر

ترجمہ: خالد آفتاب

یقینی طور پر قرآن پاک کا ایک ایسا اندازِ فکر ہے جو اور کسی جگہ نہیں ملتا۔ یہ ایک بہت دلچسپ بات ہے کہ قرآن پاک معلومات فراہم کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ''اس سے پہلے تم نہیں جانتے تھے''۔ یقیناً اس وقت کوئی بھی ایسا صحیفہ نہیں ہے جو اس قسم کا دعویٰ کرے۔ دوسری تمام تحریریں اور الہامی کتابیں جو کہ لوگوں کے پاس موجود ہیں وہ بھی بہت سی معلومات فراہم کرتی ہیں' لیکن وہ ہمیشہ یہ بیان کرتی ہیں کہ یہ معلومات کہاں سے حاصل کی گئیں۔ مثال کے طور پر جب بائبل مقدس پرانی تاریخ پر بحث کرتی ہے تو یہ بیان کرتی ہے کہ فلاں بادشاہ وہاں رہتا تھا' اس نے فلاں جنگ لڑی' ایک اور بادشاہ کے بہت زیادہ بیٹے تھے' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ہمیشہ یہ ایک بات مقرر کرتی ہے کہ اگر آپ کو مزید معلومات چاہئیں تو پھر آپ کو فلاں فلاں کتاب کا مطالعہ کرنا چاہئے کیونکہ یہ معلومات وہاں سے حاصل کی گئی ہیں۔ اس نظریئے کے برعکس قرآن پاک پڑھنے والے کو معلومات فراہم کرتا ہے اور بیان کرتا ہے کہ یہ معلومات کچھ نئی ہیں۔ یقینی طور پر قرآن پاک نے ہمیشہ فراہم کردہ معلومات' ان کی سچائی کی تصدیق اور ان پر تحقیق کرنے کی نصیحت کی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اس قسم کے نظریئے کو چودہ سو سال پہلے بھی غیر مسلموں نے چیلنج نہیں کیا۔

درحقیقت مکّہ والے جو کہ مسلمانوں سے نفرت کرتے تھے' وہ بھی کبھی قرآن پاک کی سچائی کو چیلنج نہیں کر سکے۔ وہ یہ چیلنج بار بار سنتے تھے مگر وہ کبھی یہ نہ کہہ سکے کہ ''یہ اطلاع نئی نہیں ہے'' یا ''ہم جانتے ہیں جہاں سے محمد (ﷺ) یہ معلومات لیتے ہیں'' یا ''ہم یہ بات مدرسے سے سیکھ چکے ہیں''۔ کیونکہ یہ حقیقی طور پر نئی معلومات تھیں۔ قرآن پاک کی

معلومات کی تحقیق کی نصیحت پر اتفاق رائے کے ساتھ' جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے انہوں نے لوگوں کے ایک گروپ کو منتخب کیا اور ان کو ذوالقرنین کی دیوار تلاش کرنے کے لئے بھیجا۔ قرآن پاک کے نزول سے پہلے عربوں نے اس قسم کی دیوار کے بارے میں کبھی بھی نہیں سنا تھا لیکن قرآن پاک نے اس کو بیان کیا اور وہ اس کو دریافت کرنے کے قابل ہو سکے' اور حقیقت میں یہ اب بھی وہاں دربند (Durband) کے مقام پر روس میں موجود ہے۔

میرا یہاں اس بات پر زور ہے کہ قرآن پاک بہت سی چیزوں میں بالکل درست ہے۔ لیکن درست ہونے کا یہ مطلب ضروری نہیں کہ یہ کتاب ایک مقدس آسمانی صحیفہ ہے۔ درحقیقت درست ہونا اس کے آسمانی صحیفہ ہونے کی صرف ایک کسوٹی ہے۔ مثال کے طور پر ٹیلی فون ڈائریکٹری درست ہوتی ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ آسمان سے اتاری گئی ہے۔ حقیقی مسئلہ اس بات میں ہے کہ اس بات کا ثبوت فراہم کیا جائے کہ قرآن پاک کی معلومات کا اصل سرچشمہ کیا ہے۔ اس کی تاکید پڑھنے والے پر ہے۔ کوئی بھی قرآن پاک کے مستند ہونے کی بغیر اچھے خاصے ثبوت کے محض تردید نہیں کر سکتا۔ اگر اس میں کوئی غلطی تلاش کرتا ہے تو پھر اس کو حق ہے کہ وہ اس کو غیر مستند قرار دے۔ بالکل یہی بات ہے جس کی قرآن پاک حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ایک دفعہ لیکچر کے بعد میرے پاس ایک شخص آیا' جو کہ میں نے جنوبی ایشیا میں دیا تھا۔ وہ اس پر بہت ناراض تھا جو میں نے کہا۔ سو اُس نے دعویٰ کیا کہ میں گھر جا رہا ہوں' آج رات میں قرآن پاک میں ایک غلطی ضرور نکالوں گا۔ میں نے کہا مبارک ہو' یہ سب سے عقلمندی کی بات ہے جو اب تم نے کی ہے۔ یقینی طور پر یہی وہ طرزِ عمل ہے جس کی مسلمانوں کو لے کر چلنے کی ضرورت ہے ان لوگوں کے ساتھ جو قرآن پاک کے مستند ہونے پر شک کرتے ہیں' کیونکہ قرآن پاک بذاتِ خود اسی قسم کے چیلنج کو پیش کرتا ہے۔ یہ اٹل بات ہے کہ اس کا چیلنج قبول کرنے کے بعد یہ لوگ اس بات کا یقین کر لیں گے کہ یہ صحیح ہے تو یہ لوگ اسے باور کر لیں گے' کیونکہ وہ اس کو غیر مستند ثابت نہیں کر سکے۔

مختصر یہ کہ درحقیقت قرآن پاک بذاتِ خود اپنی عزت منواتا ہے' کیونکہ وہ خود اس کے مستند ہونے کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک ضروری حقیقت جس کو بار بار نہیں کہا جا سکتا' قرآن پاک کے مستند ہونے کے متعلق کافی ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر کوئی بذاتِ خود کسی ایک عمل کی وضاحت کرنے کے لئے نااہل ہے تو ضروری نہیں کہ وہ اس عمل کا وجود قبول کرے یا کسی دوسرے شخص کی اس عمل کے متعلق وضاحت تسلیم کرے' بالخصوص صرف اس لئے کہ چونکہ ایک شخص کسی بات کی وضاحت نہیں کر سکتا تو اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ کسی دوسرے کی وضاحت کو تسلیم کر لے۔ تاہم اس کا دوسری وضاحتوں سے انکار اس ثبوت کی ذمہ داری اس شخص پر ڈال دیتا ہے کہ وہ اس کا مناسب جواب تلاش کرے۔ عام طور پر یہ نظریہ زندگی کے بہت سے معاملات پر لاگو ہوتا ہے۔ لیکن حیرت انگیز طور پر یہ نظریہ قرآن کے چیلنج پر پورا اترتا ہے اور ان لوگوں کو مشکل میں ڈال دیتا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ ''میں اس پر یقین نہیں رکھتا''۔ عین انکار کے اعلان کے وقت یہ اس شخص کے اوپر ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ بذاتِ خود وضاحت تلاش کر لے اگر وہ محسوس کرتا ہے کہ دوسروں کے جوابات ناکافی ہیں۔ (بالخصوص قرآن پاک کی ایک آیت جس کا میں نے انگلش میں ہمیشہ غلط ترجمہ دیکھا ہے)۔ اللہ ایک ایسے شخص کا حال بیان کرتا ہے جس کے سامنے ایک سچائی واضح کی گئی مگر وہ شخص اپنے فرض سے غافل رہا' کیونکہ اس نے معلومات سننے کے بعد اس کی صحت کی جانچ نہیں کی تھی۔ دوسرے الفاظ میں ہر وہ شخص خطاکار ہے جو کوئی چیز سنتا ہے مگر تحقیق نہیں کرتا کہ وہ صحیح ہے یا غلط!

اگر آپ اس سے پوچھتے ہیں کہ اس کے مطابق قرآن پاک کا اصل منبع (Source) کیا ہے تو وہ آپ کو بتائے گا کہ یہ ایک آدمی کے دماغ کی اختراع ہے جو کہ (نعوذ باللہ) سودائی تھا۔ پھر آپ اس سے پوچھیں کہ اگر یہ ان کے دماغ کی اختراع ہے تو جو اس کے اندر معلومات ہیں وہ کہاں سے آئی ہیں؟ یقینی طور پر قرآن پاک بہت سی ایسی چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جن سے عرب واقف نہ تھے۔ تو جو بات آپ نے اس سے کہی تھی اس کی وضاحت کے لئے وہ اپنی گفتگو تبدیل کرے گا اور

کہے گا کہ اچھا ہوسکتا ہے کہ وہ (حضرت محمد ﷺ) سودائی نہیں تھے' لیکن یہ تو ہوسکتا ہے کہ کسی دوسرے ملک سے آئے ہوئے شخص نے ان (ﷺ) کو یہ معلومات فراہم کر دی ہوں۔ پھر انہوں (ﷺ) نے لوگوں سے جھوٹ بول کر کہا کہ میں ایک نبی ہوں۔ اس موقع پر آپ کو اس سے پوچھنا چاہئے کہ اگر حضرت محمد ﷺ غلط تھے (نعوذ باللہ) تو پھر ان میں اتنا اعتماد کہاں سے آیا؟ اور انہوں نے ساری زندگی کیوں ایسا برتاؤ کیا جو کہ ایک نبی کا ہوتا ہے؟ پھر وہ بلی کی طرح اچھل کر دوبارہ اپنے اسی نقطۂ نظر پر واپس آ جائے گا اور پھر وہی فضول بحث شروع ہو جائے گی۔

جیسا کہ اس کا ذکر پہلے ہی کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک میں ایسی بہت سی معلومات ہیں جن کو اللہ تعالیٰ کی ذات کے علاوہ کسی اور سے منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ جیسا کہ حضرت محمد ﷺ کو دیوارِ ذوالقرنین کے متعلق کس نے بتایا جو جگہ شمال میں سینکڑوں میل کی مسافت پر تھی؟ کس نے آپ ﷺ کو ایمبر یالوجی سے متعلق بتایا؟ ان تمام باتوں کا اعتماد خود منواتا ہے کہ قرآن پاک ایک سچا اور مقدس آسمانی صحیفہ ہے۔ جیسا کہ پیغمبر ﷺ کا ایک چچا ابولہب تھا۔ یہ شخص اسلام سے اس قدر نفرت کرتا تھا کہ اس نے پیغمبر ﷺ کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ یہ شخص اگر پیغمبر ﷺ کو کسی اجنبی کے پاس کھڑا دیکھ لیتا تو ان کے جدا ہونے تک انتظار کرتا اور اس اجنبی سے جا کر پوچھتا کہ محمد (ﷺ) نے اس سے کیا کہا ہے۔ اور اگر حضرت محمد ﷺ نے کہا کہ یہ دن ہے تو وہ کہتا نہیں یہ رات ہے' اور اگر محمد (ﷺ) نے کہا ہو کہ یہ سیاہ ہے تو وہ کہتا کہ نہیں یہ سفید ہے۔ وہ اس قدر ہمدردانہ اور قابل اعتماد ہو کر بالکل اس کے مخالف بات کرتا جو کہ حضرت محمد ﷺ یا مسلمان کہتے۔ تاہم ابولہب کی وفات سے دس سال پہلے قرآن پاک میں ایک سورۃ ابولہب کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس میں بالکل واضح الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ ابولہب کو جہنم کی آگ میں ڈالا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں یہ ایک اعلان ہے اس دعوے کے ساتھ کہ ابولہب مسلمان نہیں ہوگا اور ہمیشہ کے لئے رڈ کر دیا جائے گا۔ دس سال تک ابولہب یہ کہتا رہا کہ میں نے سنا ہے کہ

محمد (ﷺ) پر نازل ہوا ہے کہ مَیں کبھی بھی تبدیل نہیں ہوسکتا' یعنی میں کبھی بھی مسلمان نہیں ہوسکتا اور آخر کار میں جہنم میں ڈال دیا جاؤں گا۔ٹھیک ہے' اچھا میں اسلام قبول کرتا ہوں' تمہیں کیسا لگے گا؟ اور اب تمہارا اس مقدس آسمانی صحیفے کی سچائی کے متعلق کیا خیال ہے؟ لیکن اس نے ساری زندگی ایسا نہیں کیا۔اور بالکل یہی سلوک اس کے ساتھ ہونا چاہئے تھا کیونکہ اس نے ہمیشہ اسلام کی مخالفت کی۔ وہ اس کے بعد دس سال تک زندہ رہا لیکن نہ اس نے اسلام قبول کیا اور نہ ہی اس کے دل میں اسلام کے لئے کوئی ہمدردی پیدا ہوئی۔ اگر حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر نہیں تھے تو آپ ﷺ کو کس طرح اس بات کا یقین ہو گیا تھا کہ ابولہب قرآن پاک کی ان آیات کی تصدیق کرے گا۔اس قدر اعتماد کس طرح ممکن ہے کہ کوئی کسی کو دس سال کا عرصہ دے کہ وہ اس کی نبوت کو غلط ثابت کر سکے!

اس کا صرف ایک ہی جواب ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے سچے پیغمبر ہیں۔اس قسم کا خطرناک دعویٰ کرنے کے بعد کسی کو یقینی طور پر یہ تسلیم کر لینا چاہئے کہ ان پر مقدس آسمانی صحیفہ نازل ہوا۔ حضرت محمد ﷺ کے اپنی نبوت پر اعتماد ہونے اور خدائی حفاظت میں ہونے کی ایک اور مثال یہ ہے کہ جب آپؐ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ مکّے سے مدینہ ہجرت کی تو ایک غار میں پناہ لی۔ان دونوں نے لوگوں کو دیکھا کہ وہ انہیں مارنے کے لئے آگے بڑھ رہے ہیں' جس سے حضرت ابوبکرؓ گھبرائے۔یقینی طور پر پیغمبر ﷺ (نعوذ باللہ) اگر جھوٹے یا جعل ساز ہوتے تو ان سے یہ اُمید کی جاتی کہ آپؐ اپنے دوست حضرت ابوبکرؓ سے فرماتے: ''اے ابوبکرؓ اس غار کے پیچھے سے کوئی راستہ دیکھو یا گھٹنے ٹیک کر ایک کونے میں خاموش ہو کر بیٹھ جاؤ''۔لیکن درحقیقت جو کچھ آپ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا اس سے آپؐ کا اعتماد اور زیادہ واضح ہو جاتا ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''اطمینان رکھو (Relax) اللہ ہمارے ساتھ ہے اور اللہ ہی ہماری حفاظت کرے گا''۔

سات سال پہلے کی بات ہے میرے گھر میں ایک وزیر آیا۔جس کمرے میں ہم

بیٹھے ہوئے تھے میز کے اوپر قرآن پاک پڑا ہوا تھا۔ وہ وزیر نہیں جانتا تھا کہ یہ مقدس کتاب کیا ہے۔ گفتگو کے دوران میں نے قرآن پاک کی طرف اشارہ کیا اور کہا میرا اس کتاب پر بہت اعتماد ہے۔ اس نے قرآن پاک کی طرف دیکھا اور بغیر یہ جانے کہ یہ کون سی کتاب ہے' کہا ''اچھا میں تمہیں بتاتا ہوں اگر یہ کتاب بائبل نہیں ہے تو یہ ایک انسان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے''۔ اس کی بات کے جواب میں مَیں نے کہا کہ ''تم مجھے بتاؤ کہ اس کتاب میں کیا ہے؟'' اور صرف تین سے چار منٹ کے دوران میں نے اس کو صرف چند چیزیں بتائیں جو کہ قرآن پاک میں موجود تھیں۔ ان تین سے چار منٹ کے بعد اس کا ذہن بالکل تبدیل ہو گیا اور اس نے واضح طور پر اعلان کیا کہ ''تم ٹھیک کہہ رہے ہو' ایک انسان ایسی کتاب لکھ ہی نہیں سکتا' اس کو تو شیطان نے لکھا ہے'' (نعوذ باللہ)۔ بدقسمتی سے اس قسم کا رویہ رکھنے کی بہت سی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ بہت جلدی میں اور ایک گھٹیا قسم کی معذرت ہے۔ دوسرا یہ کسی بھی تکلیف دہ صورت حال سے نکلنے کا سب سے فوری اور آسان حل ہے۔

بائبل میں ایک بہت ہی مشہور کہانی ہے کہ ایک دن بہت سے یہودیوں کے سامنے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک مُردے کو زندہ کیا۔ وہ آدمی چار روز سے مرا ہوا تھا۔ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے اور انہوں نے صرف اتنا کہا ''کھڑے ہو جاؤ'' تو وہ آدمی سیدھا کھڑا ہوا اور چلنے لگا۔ اس موقع پر کچھ یہودی جو اس کو دیکھ رہے تھے' انہوں نے بے یقینی سے کہا ''یہ تو شیطان ہے۔ شیطان نے اس کی مدد کی'' (نعوذ باللہ) اب یہ کہانی بار بار دنیا کے تمام گرجا گھروں میں سنائی جاتی ہے۔ اور لوگ اس پر بڑے بڑے آنسو بہا کر روتے ہیں' یہ کہتے ہوئے کہ اوہ! اگر مَیں وہاں ہوتا تو مَیں اس طرح کا احمق کبھی نہ ہوتا جیسا کہ وہ یہودی تھے۔ حالانکہ یہ لوگ پورے وثوق کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہیں جو کچھ یہودیوں نے کیا۔ جب آپ صرف تین منٹ ان کو قرآن پاک کی چند آیات دکھاتے ہیں تو یہ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ ''اوہ! اس کو تو شیطان نے لکھا ہے'' (نعوذ باللہ) کیونکہ حقیقی طور پر یہ لوگ کونے میں دھکیل دیئے گئے ہیں اور ان کے

پاس کوئی پائیدار جواب نہیں ہے اور وہ اس قسم کے گھٹیا عذر بناتے ہیں۔

ایک اور مثال جو کہ مکّہ والوں نے حضرت محمد ﷺ کی وحی کے بارے میں کہی' وہ یہ کہ شیطان حضرت محمد (ﷺ) کے پاس وحی لے کر آیا (نعوذ باللہ)۔ لیکن تھوڑی سی مزید تفصیل کے ساتھ قرآن پاک بذاتِ خود اس کا جواب دیتا ہے۔ ایک آیت میں آیا ہے: ''وہ لوگ کہتے ہیں کہ یقیناً وہ (حضرت محمد ﷺ) جن کے زیر اثر تھے۔ لیکن یہ (قرآن پاک) اور کچھ بھی نہیں سوائے جہان والوں کے لئے ایک یاددہانی کے''۔ یہ ان تمام قسم کے نظریات کے بارے میں ایک دلیل ہے۔ درحقیقت قرآن پاک میں اس نظریئے کے متعلق اور بھی بہت سی دلیلیں ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الشعراء میں اللہ تعالیٰ واضح طور پر فرماتے ہیں:

﴿وَمَا تَنَزَّلَتْ بِهِ الشَّيٰطِيْنُ ۞ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ۞ اِنَّهُمْ عَنِ السَّمْعِ لَمَعْزُوْلُوْنَ۞﴾ (آیات ۲۱۰۔۲۱۲)

''اس (کتابِ مبین) کو شیاطین لے کر نہیں اترے ہیں۔ یہ تو ان کے لئے موزوں ہی نہیں تھا اور نہ ہی وہ اس کے اہل تھے۔ ان کو تو اس کی تلاوت کی سماعت سے پہلے ہی رَدّ کر دیا جاتا ہے۔''

قرآن پاک میں ایک اور جگہ پر اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دیتا ہے:

﴿فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۞ اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ۞﴾ (النحل:۹۸'۹۹)

''جب بھی تم قرآن پاک کی تلاوت کرو تو شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ حاصل کر لیا کرو۔ اسے ان لوگوں پر تسلط حاصل نہیں ہوتا جو ایمان لاتے اور اپنے ربّ پر بھروسہ کرتے ہیں۔''

اب یہ کیسے ممکن ہے کہ شیطان خود اس کو لکھے اور وہ کسی کو کہے کہ جب تم میری کتاب پڑھنے لگو تو اللہ سے کہو کہ وہ تمہیں مجھ سے محفوظ رکھے۔ یہ بات محال ہے۔ درحقیقت انسان اس سے ملتا جلتا تو کچھ لکھ سکتا ہے' مگر کیا شیطان بھی ایسا کر سکتا ہے؟ بہت سے لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم اس مضمون کے بارے میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ایک طرف تو وہ

یہ کہتے ہیں کہ شیطان کبھی یہ کام نہیں کرسکتا اور اگر کرتا بھی تو اللہ تعالیٰ اس کو اس کی اجازت نہ دیتا' جبکہ دوسری طرف وہ اس بات پر بھی یقین رکھتے ہیں کہ شیطان اللہ تعالیٰ سے بس تھوڑا سا کم ہے۔ یعنی وہ یہ کہتے ہیں کہ غالباً شیطان ہر وہ کام کرسکتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کرسکتا ہے۔ نتیجتاً جب وہ قرآن پر نگاہ ڈالتے ہیں تو اسے حیرت انگیز پاتے ہیں۔ مگر پھر بھی وہ اصرار کرتے ہیں کہ یہ شیطان کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ کا بہت شکر ہے کہ مسلمانوں کا یہ رویہ نہیں ہے۔ اگرچہ شیطان میں بھی کچھ صلاحیتیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت ان سے بہت مختلف اور جدا ہے۔ اور کوئی مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس بات پر یقین نہ کرلے۔ یہ ایک عام سی بات ہے۔ غیر مسلم بھی مانتے ہیں کہ شیطان آسانی سے کوئی غلطی کرسکتا ہے اور اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ اگر وہ کوئی کتاب لکھے تو اپنی ہی بات کی تردید کردے۔ پھر قرآن پاک فرماتا ہے کہ:

﴿اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ﴾ (النساء:۸۲)

''کیا وہ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ یقیناً اس میں بہت سا اختلاف پاتے۔''

بنیادی طور پر غیر مسلم قرآن پاک کو جھٹلانے کی فضول کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔ قرآن پاک کی وہ آیات جن کی ابھی تک وضاحت نہیں ہوسکی ان آیات کو مدّنظر رکھتے ہوئے انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی ذاتِ اقدس پر ایک اور حملہ کیا ہے کہ (نعوذ باللہ) حضرت محمد ﷺ دیوانے اور جھوٹے تھے اور لوگوں کو جھوٹی باتوں میں فریب دے کر ان کو غلط راہ پر لگاتے تھے۔ سائیکالوجی (علمِ نفسیات) میں اس قسم کی مرض کو مائی تھومینیا (Mythomenia) کہا جاتا ہے' جس کا مطلب ہے کہ کوئی شخص جھوٹ بولے اور اس پر یقین رکھے۔ غیر مسلم یہی کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ (نعوذ باللہ) اسی مرض کا شکار تھے۔ لیکن صرف ایک مسئلہ ان کو درپیش ہے۔ اور وہ یہ کہ اس مرض کا شکار کوئی بھی شخص اس قدر صحیح اور بالکل درست حقائق پیش کر ہی نہیں سکتا' حالانکہ تمام کا تمام قرآن پاک صرف حقائق ہی پر مبنی ہے اور اس میں موجود ہر ایک چیز پر تحقیق ہوئی

اور وہ بالکل درست ثابت ہوئی۔ میں یہاں پر ایک مثال دینا چاہوں گا اور وہ یہ کہ اگر کوئی ذہنی طور پر بیمار ہے اور یہ دعویٰ کرتا ہے کہ ''میں انگلینڈ کا بادشاہ ہوں'' تو ایک ماہر نفسیات اس کو کبھی یہ نہیں کہے گا کہ ''تم بادشاہ نہیں ہو، تم تو پاگل ہو''۔ بلکہ وہ اس کے ساتھ حقائق میں بات کرے گا اور کہے گا ''ٹھیک ہے، تم کہتے ہو کہ تم انگلینڈ کے بادشاہ ہو، پھر مجھے بتاؤ کہ آج ملکہ کہاں ہے؟ تمہارا وزیر اعظم کہاں ہے؟ اور تمہارے محافظ کہاں ہیں؟'' اب ان سوالوں کو سنتے ہی واقعی وہ پریشان ہو جائے گا اور بہانے ڈھونڈنے کی کوشش کرے گا اور وہ کہے گا ''اوہ ملکہ! وہ تو اپنی ماں کی طرف گئی ہے۔ اوہ وزیر اعظم! وہ تو مر گیا ہے۔'' اور آخر کار اس کا علاج کیا جائے گا، کیونکہ وہ ان سوالات کا سامنا نہیں کر سکتا۔ اور اگر ماہر نفسیات اسی قسم کے حقائق پر مبنی سوالات اس کے سامنے پیش کرتا جائے تو بالآخر وہ حقیقت کو تسلیم کر لے گا اور کہے گا کہ میرا خیال ہے کہ میں انگلینڈ کا بادشاہ نہیں ہوں۔ بالکل قرآن پاک کا بھی یہی طریقہ کار ہے۔ جو کوئی بھی اس کی تلاوت کرتا ہے قرآن پاک بالکل ایک ماہر نفسیات کی طرح اس کے ساتھ سلوک کرتا ہے۔ قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

﴿یٰاَیُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوْرِ وَهُدًی وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (یونس:۵۷)

''لوگو! تمہارے پاس تمہارے ربّ کی طرف سے نصیحت آ گئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو دلوں کے امراض کی شفا ہے اور جو اسے قبول کر لیں ان کے لئے راہنمائی اور رحمت ہے۔''

پہلی نظر میں یہ ایک غیر واضح قسم کی تحریر معلوم ہوتی ہے، لیکن اس آیت کے معانی بالکل واضح ہو جاتے ہیں جب کوئی اوپر بیان کردہ مثال کی روشنی میں اس کا مطالعہ کرتا ہے۔ درحقیقت کوئی بھی شخص صحت یاب ہو جاتا ہے جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف یہ ایک علاج ہے بلکہ اس میں حقیقی طور پر شفا بھی ہے ان لوگوں کے لئے جو اس کے حقائق کو تسلیم کرتے ہیں۔

(جاری ہے)

بچوں کی تعلیم و تربیت

پیدائش سے لڑکپن تک

ڈاکٹر انعام اللہ☆

تعلیم و تربیت ایک ایسا عمل ہے جس میں پرانی نسل ہر آنے والی نسل کو چار چیزوں سے بہرہ ور کرتی ہے:

۱) اپنی اقدار ۲) رویہ ۳) ہنر ۴) معلومات

بظاہر اس ترقی یافتہ دَور نے جہاں ایک طرف انسانوں کو مریخ پر بستیاں بسانے کے قابل بنایا ہے وہاں دوسری طرف اپنے قریب رہنے والے انسانوں سے بہت حد تک دُور کر دیا ہے ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا
آج تک فیصلہ نفع و ضرر کر نہ سکا!

ہمارے معاشرے کے اکثر والدین نے پیدائش کے فوراً بعد ہی اپنے بچوں کو ٹی وی کے سامنے بٹھا کر اپنی دانست میں انہیں ترقی یافتہ اقدار اور معلومات سکھانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ بچے کی پیدائش کے اوّل روز ہی سے ٹی وی نے ماں باپ کا تربیتی کردار اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے جس کے بھیانک نتائج نئی نسل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ بگڑی ہوئی اولاد گھر میں مضطرب، ناراض اور ذہنی الجھاؤ کا شکار رہتی ہے۔ ماں باپ اس کی بدسلوکی سے نالاں رہتے ہیں، جبکہ عملی زندگی میں قدم رکھنے پر ان کی خودغرضانہ سوچ اور بُرے اخلاق کی وجہ سے معاشرے کا ہر شخص انہیں ناپسند کرتا ہے اور والدین کو

☆ ایم بی بی ایس، ڈی سی ایچ، ایم آر سی پی (یو کے) پلیڈرلائن، اٹک

لوگوں کی شکایات کی وجہ سے سخت خفت اٹھانا پڑتی ہے۔

ایسے بگڑے ہوئے بچے معاشرے میں مثبت کردار ادا کرنے کے بجائے منفی رویئے پروان چڑھاتے ہیں اور مجرمانہ ذہنیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے عمومی طور پر پوری نسل' معاشرے اور ملک کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بات کا فیصلہ کرلیں کہ انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش چند اصولوں کے تحت کرنی ہے جس کا مقصد ان کو آئندہ خطرات سے بچانا ہے۔ یہ تبھی ہوسکتا ہے جب بچوں کے اندر نظم وضبط پیدا ہو' وہ اچھی عادات سیکھیں' صاف ستھرے رہیں' سخت جان اور پُر جوش ہوں' مضبوط اور بہادر ہوں' ذمہ داری قبول کرنے میں پہل کریں' اللہ کی فرماں برداری کریں تاکہ آئندہ زندگی میں کامیاب رہیں اور آخری عمر میں والدین کے لئے باعث رحمت ہوں۔ امام غزالیؒ کے مطابق تعلیم وتربیت کا مقصد اللہ کی معرفت پیدا کرنا ہے تاکہ انسان اپنے مقصدِ وجود سے روشناس ہوجائے۔

بچوں کی نفسیات

والدین بچے کے قدرتی استاد ہیں' گھر قدرتی اسکول اور شروع میں اس کے کھلونے اس کی کتابوں کا کردار ادا کرتے ہیں۔ والدین کو بچوں کی نفسیات اور نشوونما کے بارے میں جاننا چاہئے تاکہ وہ اس کی عمر کے مطابق اپنے رویوں میں تبدیلی لاکر بہتر تعلیم وتربیت کرسکیں اور بچے کی حسی صلاحیتوں کی ترقی میں معاون ثابت ہوسکیں۔ پیدائش کے چھ ہفتے بعد بچہ ماں کے چہرے پر نظریں گاڑنا شروع کرتا ہے اور تیز آواز سن کر بلک جاتا ہے۔ تین سے چار ماہ میں اپنی گردن سنبھالنا شروع کرتا ہے اور پانچ سے چھ ماہ کی عمر میں کھلونوں کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کرتا ہے۔ نو ماہ کی عمر سے پہلے بچہ مکمل طور پر ماں باپ پر انحصار کرتا ہے۔ یہاں سے اس کی شخصیت بننا شروع ہوتی ہے۔ نو ماہ کے بعد نظم کے بارے میں نرمی کے ساتھ تربیت شروع کردینی چاہئے اور اس کو واضح طور پر بتانا شروع کردینا چاہئے کہ کیا چیز اُس کے لئے خطرناک ہے۔ ماں پہلے سال میں بچے کے لئے اہم ترین شخصیت ہوتی ہے جبکہ ایک سے تین سال کی عمر

میں بچہ اپنے آپ کو اہم ترین ہستی خیال کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ سارا خاندان اس کی خواہشات کے مطابق چلے۔ اس کا منفی رویہ عروج پر ہوتا ہے اور بعض اوقات بھری محفل میں والدین کو شرمندہ کر دیتا ہے۔ اس عمر میں والدین کا رویہ نرم رہنا چاہئے' خصوصاً باپ کا' کیونکہ اس عمر میں باپ کی پہچان' اس کی اہمیت اور ضرورت اجاگر ہونا شروع ہوتی ہے۔ چار سال کی عمر میں بچہ اپنے تجربات اور مشاہدات کی بنا پر سیکھنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اس کے تجسس کا مادہ عروج پر ہوتا ہے اور وہ اپنے والدین سے ایک دن میں چار سو تک سوالات پوچھتا ہے۔ ایسے میں غیر محتاط جوابات یا رویہ اسے ذہنی انتشار کا شکار کر دیتے ہیں۔ بار بار ڈانٹنے سے یہ بچہ چڑچڑا' بدمزاج اور کند ذہن بن سکتا ہے۔ اس عمر میں بچہ اپنے معاملات خود سلجھانے کی کوشش میں لگا رہتا ہے جس کا معصوم ذہن ایک صاف کاغذ کی مانند ہوتا ہے۔ اس عمر میں اس کی مناسب رہنمائی' اخلاق' عقائد' معاملات' عبادات اور معاشرتی رویوں کے بارے میں مناسب انداز میں سکھانا ضروری ہے۔ پانچ سے چھ سال کی عمر میں بچوں میں شدید خواہش ہوتی ہے کہ وہ کیسے اپنے والدین یا اساتذہ کی طرح بن جائیں۔ لڑکا اپنے باپ کی طرح اور لڑکی اپنی استانی کی طرح بننے کی کوشش کر سکتی ہے۔ یوں والدین اور اساتذہ بغیر بولے اس کے لئے تربیت کا باعث بنتے ہیں۔ موجودہ ذرائع ابلاغ نے اس قدرتی تعلق کو بہت حد تک مسخ کر دیا ہے۔

سات سال کی عمر میں بچے میں علم حاصل کرنے کی استعداد پیدا ہو جاتی ہے۔ اس عمر میں اسے علم کی اہمیت سے روشناس کیا جائے اور سنجیدگی کے ساتھ علم حاصل کرنے کی ترغیب دی جائے تاکہ وہ علم کے اخلاقی' روحانی' معاشی اور مادی فوائد حاصل کر سکے۔ اس عمر میں نظم پیدا کرنے کی بہترین صورت ''نماز'' کی تلقین ضروری ہے۔

تعلیم و تربیت کے چند بنیادی اصول

آج کے دور میں والدین کو شام کا وقت اپنے بچوں کے ساتھ گزارنا چاہئے۔ ایک والد کو ایک دن میں دو گھنٹے اپنے بچوں کی تربیت کے لئے وقف کرنے چاہئیں تاکہ بچہ آزادانہ ذرائع ابلاغ کے مضر اثرات سے بچ سکے۔ والدین کو اپنی ترجیحات

متعین کرنی چاہئیں۔ بچوں کی الجھنیں سنیں' ان کا حل تلاش کرنے میں مدد دیں' حالات کا تجزیہ کرنا سکھائیں' سبق آموز واقعات' اپنی تاریخ' قرآن کی تعلیمات اور رسول اکرم ﷺ کے طریقوں کی اہمیت سمجھائیں' ان کی تعلیمی سرگرمیوں کا جائزہ لیں' ان کے ساتھ سخاوت' رحم دلی اور نیکی سے پیش آئیں۔ ان کی عادات واطوار اچھی بنائیں۔ انہیں معاشرتی آداب (یعنی والدین کے حقوق' اساتذہ کے حقوق' رشتہ داروں کے حقوق' بہنوں' بھائیوں کے حقوق' دوستوں اور ساتھیوں کے حقوق' بڑوں اور چھوٹوں کے حقوق) اور اجتماعی آداب (اخوت' رحمت' ایثار' عفوودرگزر' جرأت وبہادری' احسان اور سخاوت) تفصیل کے ساتھ سکھائیں اور سمجھائیں۔ ان کا بچپن خوش کن اور پُرامن ہونا چاہئے۔ ان کو طہارت کے طریقے' ملنے جلنے اور اٹھنے بیٹھنے کے آداب' کھانے پینے کے آداب سکھانا ضروری ہیں۔ اچھی کھیلوں مثلاً نشانہ بازی' تیراکی' فٹ بال' ہاکی اور جہاں تک ممکن ہو گھڑسواری کی تربیت دوسری کھیلوں کی نسبت بہتر ہے۔

تعلیم وتربیت کے مندرجہ ذیل تین اصول یاد رکھیں اور انہی کو بنیاد بنا کر بچے کی نشوونما کریں:

۱) بچوں میں شروع ہی سے اللہ کا خوف پیدا کیجئے۔ اللہ کے علاوہ کسی چیز مثلاً بلاؤں' چڑیلوں' بلیوں اور کتوں سے ڈرانے سے احتراز کیجئے۔ تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ شروع عمر کے خوف ساری عمر انسان کے دماغ پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ غیر ضروری چیزوں کے ڈرانے سے بچے بزدل بن جاتے ہیں۔ یہ بات بھی سمجھ لیں کہ اللہ کے ڈر کے سوا دنیا کا کوئی قانون انسان کو جرم سے باز نہیں رکھ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے نام نہاد مہذب ترین ممالک میں جرائم کی شرح میں تمام انسانی تدابیر کے باوجود اضافہ ہی ہوتا چلا جارہا ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے ترقی یافتہ انسان کو اس کے خالق سے ناآشنا کر دیا ہے۔ لہٰذا اللہ کی معرفت پیدا کر دینا ہی ہماری تعلیم وتربیت کی بنیاد ہونا چاہئے۔ اللہ کا خوف ہی کسی معاشرے میں جرائم کم کرنے میں سب سے زیادہ بڑا کردار ادا کرسکتا ہے۔

۲) بچوں کو شروع ہی سے جھوٹ سے بچائیں اور انہیں صاف گوئی کی تلقین کریں۔

حالات کیسے ہی ہوں وہ حق گوئی ہی پر قائم رہیں۔ بچہ قدرتی طور پر صاف گو ہوتا ہے۔ وہ اپنے بڑوں سے جھوٹ بولنا سیکھتا ہے۔ آپ کے قول و فعل میں تضاد اس کے لئے الجھن کا باعث بنتا ہے۔ کم از کم بچوں کے سامنے آپ کا غیر محتاط رویہ ٹھیک نہیں۔ فریب اور دھوکہ دہی سے عارضی طور پر چند فوائد حاصل ہو سکتے ہیں لیکن ان کے نتیجے میں اس دنیا ہی میں بے چینیوں اور پریشانیوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ فریب اور دھوکے کے ماحول میں پلی ہوئی اولاد کبھی اپنے ماں باپ کی خیر خواہ نہیں ہو سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ وہ انہیں عین اس وقت چھوڑ جاتی ہے جب والدین کو ان کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ لہٰذا کردار کی تعمیر میں صبر و تحمل اور مسلسل کوشش ضروری ہے' کیونکہ بسا اوقات کسی برائی کو چھوڑنے یا کسی اچھائی کو اختیار کرنے میں کئی کئی ماہ لگ سکتے ہیں۔

۳) بچے کو شروع ہی سے سادگی کی تعلیم دیجئے۔ رہن سہن میں' کھانے پینے میں اور خوشی' غمی کے معاملات میں شان و شوکت اور بے جا آرائش سے اجتناب کریں۔ اپنے معیارِ زندگی کو اعتدال پر رکھیں جس سے معاشی مسائل آدھے رہ جاتے ہیں۔ خود بھی سادہ زندگی بسر کریں اور بچوں کو بھی اس پر قانع رکھیں۔ ہم نے مجاہدانہ زندگی چھوڑ کر اور مسرفانہ زندگی اپنا کر بہت بڑا گناہ کیا ہے۔ یہ وطیرہ ہم نے اس طور اپنایا ہے کہ یہود و ہنود بھی شرما جائیں۔ یہ اُمت کے زوال کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ اونچے معیارِ زندگی اور پُرتعیش طرزِ زندگی سے پیچھا چھڑانے کی سنجیدگی سے کوشش کی جانی چاہئے۔ پُرتعیش زندگی گزارنے والے سکون حاصل کرنے کے منحوس چکر میں پھنس جاتے ہیں۔ وہ مزید آرام حاصل کرنے کی کوشش میں ساری عمر کھپانے کے باوجود آرام کی نیند نہیں سو سکتے۔ انہیں آرام و سکون حاصل کرنے کے لئے بے تحاشا دوائیں استعمال کرنا پڑتی ہیں۔ ہمارے نام نہاد اونچے طبقے اور مغربی معاشرے کا یہ المیہ ہے۔ والدین ضروریاتِ زندگی اور فضولیاتِ زندگی میں فرق کریں۔ بچوں کو آرام طلب بنانے کے بجائے سخت کوش لیکن باذوق بنائیں۔ بچوں کو حلال کما کر کھلائیں' حرام ذرائع آمدن سے پرہیز کریں۔ آج کے دور

میں ایک بظاہر بے ضرر لیکن تمام معاشی بے انصافیوں کی جڑ یعنی ''سود'' سے حتی الوسع اجتناب کریں اور سود کے بھیانک خطرات اور نتائج سے اپنے آپ کو باخبر رکھنے کی کوشش کریں۔ اپنی زندگی کی حدود متعین کریں تاکہ آپ کے بچے بھی بڑے ہو کر اپنے آرام کی خاطر حلال وحرام میں فرق کر سکیں ۔

کیا گیا ہے غلامی میں مبتلا تجھ کو
کہ تجھ سے ہو نہ سکی فقر کی نگہبانی

والدین کی ذمہ داریاں

والدین اپنے بچوں کو جو سب سے بہتر چیز دے سکتے ہیں وہ بہترین تربیت ہی ہے۔ ہمیں اپنے گھر والوں کو دنیا کے خطرات کے علاوہ اُخروی خطرات سے بچانا ہے۔ ازروئے الفاظ قرآنی: ﴿قُوْا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا﴾ اس دور میں مغربی تہذیب نے خاندان کے مرکزے کو تباہ کرنے کا بیڑا اٹھایا ہے جس سے مغربی معاشرے میں گھمبیر مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ وہاں والدین اپنے بچوں کے قتل اور ان کے ساتھ جنسی جرائم میں ملوث نظر آتے ہیں۔ بچوں کی اکثریت اپنے اصل والد سے روشناس نہیں۔ وہاں کے قانون نے شادی کو غیر ضروری قرار دے کر انسانیت پر سخت ظلم کیا ہے۔ حکومت کو بچوں کی کفالت اور تعلیم وتربیت کا ذمہ دار بنا کر اپنے آپ کو مہذب معاشرہ سمجھنے والوں کی اپنی تحقیق نے یہ ثابت کیا ہے کہ اچھے والدین کی محبت اور پرورش سے زیادہ اہم بچے کی تعلیم وتربیت میں کوئی چیز نہیں۔

ہمارے ذرائع ابلاغ مغرب کی اندھا دھند پیروی کر رہے ہیں اور اپنی عمدہ روایات سے انحراف کر کے اپنی نسل کے لئے بے تحاشا پیچیدگیاں پیدا کر رہے ہیں۔ ہمارے والدین کے لئے اس کا ادراک بہت ضروری ہے اور اس چیز کو دوسرے والدین کے ذہن نشین کرانا ضروری ہے۔ ماں کی گود بچے کا پہلا مدرسہ ہے۔ والدین کے لئے ضروری ہے کہ وہ شروع ہی سے اپنے بچوں خصوصاً اپنی بچیوں کو تعلیم وتربیت کے اسلامی اصول ازبر کرائیں' ان کو کتاب وسنّت کی تعلیم اور دین کی اہمیت سے آراستہ کریں اور حلال وحرام کی تمیز سکھائیں۔ اپنے گھروں کو غیر اسلامی رسوم ورواج

سے پاک کریں اور ذرائع ابلاغ کے مضر اثرات سے بچائیں۔

بچیاں، لڑکیاں اور عورتیں مستقبل کی مائیں ہیں۔ وہ اپنی اولاد کی تربیت جتنے اعلیٰ معیار پر کریں گی اتنا ہی اعلیٰ معاشرہ وجود میں آئے گا۔ عورت کی تربیت پر اسلام پسندوں کو اپنا ذہن اور وقت خرچ کرنا ہوگا' کیونکہ ایک عورت کی تربیت ایک نسل کی تربیت کی ضامن ہے' جبکہ ایک مرد کی تربیت صرف ایک فرد کی تربیت کا باعث بنتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایک خامی یہ ہے کہ والد اپنے آپ کو بچے کی نگہداشت اور شروع کی تربیت کے فریضے سے بری الذمہ سمجھتا ہے اور بیوی سے توقع رکھتا ہے کہ وہی بچوں کے تمام مسائل حل کرے۔ عورت اور بچوں کی تربیت ایک والد کا فریضہ بنتا ہے۔ اس کو چاہئے کہ گھر میں ایسی ہم آہنگی پیدا کرے جس سے بچوں کی تربیت دوستانہ ماحول میں ہو۔ تربیت کے جو اصول بھی وضع کئے جائیں والد اور والدہ دونوں سختی سے اس پر کاربند رہیں۔ غیر مستقل مزاجی اور بے اعتدالی سے بچہ ذہنی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے اور انتہا درجے کی نرمی یا بے جا سختی بچے کو بگاڑ سکتی ہے۔ بچوں کے رویوں' کاموں اور تفریحات کے بارے میں پابندیاں اور حدود بہت واضح اور متعین ہونی چاہئیں۔

بچوں کی تربیت کے سلسلے میں درج ذیل نکات کا سمجھنا ضروری ہے

۱) بہت سارے والدین اپنے بچوں کی تربیت اسی نہج پر کرنا چاہتے ہیں جس پر ان کی اپنی تربیت ہوئی ہے' چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہتا ہے اور بعض خاندانی مسائل سے چھٹکارا ناممکن ہو جاتا ہے جو موروثی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اعتدال کے جو اصول دین میں متعین ہیں اپنے رویوں کو انہی سے پرکھا جائے۔

۲) بعض مائیں نظم قائم کرنے کی ذمہ داری مکمل طور پر شوہروں پر ڈال دیتی ہیں۔ اگر ماں بچے کو یہ کہہ کر ڈرائے کہ ''تمہارے ابو آئیں گے تو بتاؤں گی'' یہ اس کی ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ایسی ماں کو از سر نو بچے کی پرورش کے اصول عملی طور پر سیکھنے چاہئیں۔

۳) بہن بھائیوں کی آپس کی رقابت اور لڑائیاں بچوں کی قدرتی نفسیات کا حصہ ہیں۔

ان پر زیادہ پریشان نہ ہوں۔ کبھی کبھی بچے کا والدین پر غصے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

۴) جنس کے بارے میں معلومات میں دلچسپی رکھنا قدرتی عمل ہے۔ اس بارے میں والدین کو حکمت کے ساتھ بچے کو سمجھانا چاہئے۔ انتہائی سخت رویہ نفسیاتی پیچیدگیاں پیدا کر سکتا ہے۔

۵) بعض قریبی خاندانوں میں چپقلش بچوں کی لڑائیوں کی وجہ سے ہو جاتی ہے۔ یہ ناچاقی قریبی رشتہ داروں اور ہمسایوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بہت عرصے تک گھن کی طرح چاٹ سکتی ہے۔ اس کا سدّ باب اپنے آپ کو اور اپنے بچے کو سمجھانے سے ہو سکتا ہے۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو حد درجے کا حساس شخص بن کر نہ سوچا جائے۔

۶) گھر کے اندر مَرد نوکر نہ رکھا جائے۔ تمام دنیا کی تحقیق نے اس کے بُرے نتائج سے آگاہ کیا ہے۔ نوکرانی اور نوکر دونوں کی صورت میں ان کی کڑی نگرانی ضروری ہے تاکہ وہ بچوں کو بُری عادتیں نہ سکھائیں۔

۷) شادی سے پہلے اور خصوصاً شادی کے بعد ایک عورت کو اپنا وقت وقتی تفریحات' گانے بجانے' بننے سنورنے اور مخلوط محفلوں کے بجائے گھر کے کام کاج کے علاوہ دین کے مطالعے' نماز کی ادائیگی اور اللہ کی طرف رجوع اور دعا میں گزارنا چاہئے۔ اس سے اس کی ہونے والی اولاد نیک خصوصیات کی حامل ہوگی۔ تحقیقات نے ثابت کیا ہے کہ ہیجان خیز طرزِ زندگی حاملہ کے پیٹ میں بچے پر بھی اثر انداز ہو سکتی ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد ماں اپنے بچے کے لئے دعاؤں کے علاوہ جو سب سے زیادہ اہم تحفہ دے سکتی ہے وہ اس کا اپنا دودھ ہے۔ اس بات سے آج کل لاپرواہی برتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں بہت سے بچے بوتل کے دودھ پر پلنا شروع ہو گئے ہیں جن کا اثر آنے والی زندگی میں ان کے جسم کے علاوہ ان کے ذہن پر بھی پڑتا ہے۔ وہ ذہانت میں ماں کا دودھ پینے والے بچوں سے کہیں کم ہوتے ہیں اور غیر انسانی اخلاق کے حامل بن سکتے ہیں۔

۸) ایک سے سات سال کے بچے شروع کی تربیت میں مشکل ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان بچوں کو اس طرح سمجھائیے جیسے آپ چاہتے ہیں کہ آپ کو کوئی بڑا سمجھائے۔ بچے

کی ڈھٹائی اور بدتمیزی کو اپنی انا کا مسئلہ نہ بنائیں۔ ایک دور میں منفی رویہ اس کی شخصیت کا حصہ ہوتا ہے لہٰذا اس کی ''نہ'' کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ بچے کے ساتھ خواہ مخواہ بحث مت کیجئے۔ مختصر اور آسان الفاظ میں سمجھائیے' لمبی گفتگو نہ کیجئے۔ آپ کا انداز پُرعزم اور سنجیدہ ہونا چاہئے۔

۹) بچے کو وقت سے پہلے بڑا نہ سمجھئے' ورنہ وہ آپ کی نگاہ میں ناقص ہونے کی وجہ سے خود بخود ناقص ہو جائے گا۔ اگر بچے کو ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کی جائے' خواہ مخواہ تنقید ہو اور ہر معاملے میں حوصلہ شکنی کی جائے تو وہ مستقبل میں ناکام ثابت ہوگا۔ بچے کو غصے اور چڑچڑے پن سے بچانے کے لئے آپ کو خود تحمل اور بردباری سے کام لینا پڑے گا۔ آپ کی بُری مثال سے بچہ بھی وہی کچھ سیکھے گا۔

۱۰) بچے کی ایک دفعہ کی بدتمیزی پر لمبے عرصے تک معاندانہ رویہ اختیار نہ کریں' ورنہ وہ دوسروں کو اپنا دشمن سمجھنا شروع کر دے گا اور انتقاماً کج روی اختیار کرے گا۔

۱۱) ایک وقت میں مشکل بچے کے لئے تین چار اصولوں پر توجہ دیں۔ بیک وقت بہت سارے قوانین لاگو کرنے کی کوشش نہ کریں۔ عموماً حالات قابو سے باہر تبھی ہوتے ہیں جب والدین خود بُری مثال بنیں۔

۱۲) بدتمیز بچہ بے صبرا اور بدنظم ہوتا ہے۔ اسے زندگی میں زیادہ خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ماحول کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو بے وقعت سمجھنے لگتا ہے اور ذہنی دباؤ کا شکار ہو کر نفسیاتی مریض بن سکتا ہے۔ اس کا رویہ بہتر بنانے کے لئے مستقل مزاجی کے ساتھ اس کی اچھی عادتوں کی حوصلہ افزائی کریں اور بُری عادتوں کی احسن انداز میں حوصلہ شکنی کریں۔

۱۳) اگر بچہ کسی جائز چیز پر غصے کا اظہار کرتا ہے تو آپ اطمینان سے اس کو تسلی دیں کہ اس کا غصہ بجا ہے۔ اس سے ایسی گفتگو نہ کریں جو وہ سمجھ نہ سکتا ہو۔

۱۵) ایک سے تین سال کے بچے کو غیظ و غضب کا دَورہ پڑ سکتا ہے۔ اگر یہ دَورہ بار بار پڑے تو والدین کی بحیثیت والدین تربیت ضروری ہے۔ کیونکہ یہ ان کی اپنی خامیوں کا آئینہ دار ہے جس کا سدِ باب انہیں خود کرنا ہوگا۔ ایسے بچے کو تھوڑی دیر

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

ذات پات کی نفسیات اور اسلام [1]

تحریر: عبدالغفور عاجز

دورِ جدید کا دانشور اور مفکر جب انسانی فوز و فلاح اور خوشحالی کی طرف دیکھتا ہے تو نتیجتاً انسان کی عظمت اور فلاح و کامیابی کو انسان کی حریت و اخوت اور مساوات کے مترادف ہونا قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے انسانیت کے لئے مساوات کو سب سے اہم قدر مانا جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ نے بنیادی انسانی حقوق کا منشور تیار کیا تو اس میں مساوات کی قدر کی اہمیت کے پیش نظر اس کو شروع میں رکھا۔

افلاطون کے تصور جمہوریت پر نظر دوڑائیں تو اس نے بھی سب انسانوں کو برابر نہیں رکھا۔ دوسری طرف یورپ والے افلاطون کے نظریات کو جمہوریت کی بنیاد قرار دے کر کہتے ہیں کہ فرانسیسی بغاوت سے حریت' اخوت اور مساوات پیدا ہوئیں۔

اسلام سے پہلے دنیا میں مساوات کا کوئی تصور نہیں تھا۔ لوگوں نے خدا کے بندوں کے درمیان حسب ونسب' مال و دولت' رنگ و روپ اور شکل وصورت کی دیواریں قائم کر رکھی تھیں۔ انسان کی انسان پر ناروا حاکمیت نے اس کی بزرگی وعظمت کو زیادہ نقصان پہنچایا۔ ہندوستان والے اپنے سوا سب کو ناپاک سمجھتے تھے۔ خود اپنے کو بھی چار ذاتوں میں منقسم کر دیا۔ چوتھی ذات شودروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ یہ تھے انسانوں کے خود ساختہ قوانین جن کے ذریعے انسان انسانوں کو ذلت کی گہرائیوں میں خود ہی دھکیل دینے کا کھیل کھیلتے رہے ہیں۔ دوسری طرف ایرانی معاشرہ چار ذاتوں میں بٹا ہوا تھا اور رومنوں نے حاکمیت اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی' باقی سب کو غلام سمجھتے تھے۔ بنی اسرائیل نے خود کو خدا کی اولاد قرار دے کر باقی سب کو نیچ اور کمتر سمجھنا شروع کیا ہوا تھا اور اپنی قوم میں خود ہی کئی بیرونی مدارج بنائے ہوئے تھے۔

عرفات حج کی اصل عبادت گاہ تھا' لیکن قریش وہاں نہیں جاتے تھے' وہ اس میں

اپنے خاندان کی توہین سمجھتے تھے۔ وہ صرف مزدلفہ تک جا کر ٹھہرتے تھے۔ باقی تمام عرب عرفات میں جمع ہوتے۔ اس چیز کو مٹانے اور ختم کرنے کے لئے خصوصاً حکم ہوا کہ ''جب تم عرفات سے لوٹو تو مشعرحرام (مزدلفہ) کے پاس اللہ کا ذکر کرو۔''

اس روئے زمین پر جو انقلاب برپا ہوئے ان کے تقابلی مطالعہ سے یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ ان میں سے بعض انقلاب محض سیاسی، بعض اقتصادی، بعض ثقافتی اور بعض وقتی تھے۔ لینن اور ماؤ کا انقلاب محض اقتصادی اور سیاسی تھا، اخلاقی اور روحانی نہ تھا۔ لینن اور ماؤ جدلیاتی مادیت (Dialectical Materialism) کے قائل ہونے کی وجہ سے مابعد الطبیعیات کے سرے سے منکر ہیں۔ پس لینن اور ماؤ کے برپا کئے ہوئے انقلاب بھی ناقص اور ادھورے ہیں۔ مگر داعی انقلاب حضور اکرم ﷺ نے اس روئے زمین پر جو انقلاب برپا کیا وہ اخلاقی بھی تھا روحانی بھی، ثقافتی بھی تھا سیاسی بھی اور اقتصادی بھی، طبیعیاتی (Physical) بھی تھا اور مابعد الطبیعیاتی (Meta Physical) بھی۔

ارشادِ خداوندی ہے کہ ﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ (آل عمران:۱۰۳) ''اس کی نوازش سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔'' اس آیت میں اسی نعمت (مساوات) کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصد سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق اور تولید ہو۔ (زمیندار، ۲۴ جون ۱۹۲۳ء)

مسلم معاشرے کی سعادت و فلاح نظامِ عدل سے وابستہ ہے اور فرد کی سعادت اجتماعیت کی سعادت میں مضمر ہے۔ نظامِ عدل کا معاشی تصور یہ ہے کہ ﴿خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ یعنی تمام اشیائے کائنات تمام انسانوں کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ لہٰذا ایک انسان کو دوسرے انسان کی معاشی غلامی سے محفوظ رکھنے کے لئے

استحصال و اجارہ داری کے تمام دروازے بند ہوں۔ معاشی دستبرد کے ذریعے حاکم و محکوم اور اعلیٰ و ادنیٰ کا امتیاز نہ ہو۔ غیر فطری و غیر انسانی اونچ نیچ یکسر ختم ہو۔ انفرادی ملکیت اجتماعی حقوق کے تابع ہو۔ ملی مصالح انفرادی مصالح پر مقدم ہوں۔ ان خصوصیات سے جو معاشی نظام تشکیل پائے گا وہ اسلام کا آئیڈیل معاشی نظام ہوگا جس کو اسلام اپنے مثالی معاشرے میں بروئے کار دیکھنا چاہتا ہے۔

اسلام میں ایک دوسرے سے الگ اور بکھرے ہوئے مسلمانوں کا کوئی تصور نہیں۔ وہ تو ایک ایسا معاشرہ بنانا چاہتا ہے جس میں مسلمان آپس میں اس طرح متحد ہوں جس طرح ایک جسم کے تمام اعضاء۔ کفر کی سب سے نمایاں خرابی آپس کا بغض اور افتراق ہے اور اسلام کی سب سے نمایاں خوبی اخوت اور اتحاد ہے۔ حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تمام مؤمنین گویا ایک جسم کی طرح ہیں' اگر ایک آنکھ دکھتی ہے تو سارا ہی جسم دکھتا ہے اور اگر سر دکھتا ہے تو بھی سارا جسم دکھتا ہے۔'' (رواہ مسلم)

درجہ بندی کے متعلق فرمایا: ﴿وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا﴾ (الاحقاف:۱۹) ''اور ہر ایک کے لئے درجے ہیں اس کے مطابق جو عمل انہوں نے کئے''۔ ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (بنی اسرائیل:۷) ''اور ہم نے نسلِ آدم کو بزرگی عطا کی۔'' اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے' کمزوروں اور مظلوموں کی مدافعت کرنے والا ایک طریقہ حیات ہے جس میں اونچ نیچ کا کوئی تصور نہیں۔ ذات اور پیشے کے اعتبار سے کوئی امتیاز نہیں۔ تعصب اور تنگ نظری کا کوئی دخل نہیں۔ عظمت ہے تو صرف کردار کی پختگی اور اللہ تعالیٰ کی عبودیت اختیار کرنے میں ہے۔

مدینہ میں حضور ﷺ کی تشریف آوری کے موقع پر انتخاب کی جگہ پر رضائے الٰہی کی مثال سے واضح ہے کہ اس کے ہاں عظمت و منزلت کا معیار کیا ہے۔ اس سے حسب و نسب اور مال و زر والوں کی قدر و قیمت عیاں ہو جاتی ہے۔ تمام انسان بلا امتیاز نفس واحدہ سے پیدا کئے گئے ہیں۔ اس سلسلہ میں ارشادِ ربانی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا

رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (النساء:۱) ''اے لوگو! اپنے ربّ سے ڈرو جس نے تمہیں ایک ہی نفس سے پیدا کیا۔'' مساوات کے ضمن میں قرآن حکیم میں ایک جگہ قانونِ خداوندی ہے کہ ﴿مَا خَلْقُكُمْ وَ لَا بَعْثُكُمْ اِلَّا كَنَفْسٍ وَّاحِدَةٍ﴾ (لقمان: ۲۸) ''تمہارا پیدا کرنا اور تمہارا اٹھایا جانا ایک ہی جان کی طرح ہے''۔

جس طرح جمہوریت کی نظر میں ایک ایم اے پاس اور ایک ان پڑھ کا ووٹ برابر ہے کچھ یہی انداز ہمارے ان انا پسندوں' خود داروں اور حسب ونسب کے پجاریوں کا ہے۔ ان کی نظر میں ایک انسان نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہو مگر وہ چونکہ ان کے دنیاوی رولز کے مطابق نسل انسانی کے اس معیار کے مطابق نہیں لہٰذا وہ اعلیٰ تعلیم و اخلاق اور حسن کارکردگی اور تقویٰ و پرہیزگاری کے باوجود ناکارہ' کمترین' کہترین اور معمولی ہے۔

ان اسباب وعلل کے پیش نظر انسان کی عظمت کا معیار اسلام اور ان لوگوں میں متنازع رہا ہے۔ اس پس منظر میں انسان کو اپنی غلامی اور بندگی کے داغ سے آزاد کرنے کی یہ آواز چونکہ بالکل نرالی اور انوکھی سمجھی گئی لہٰذا وقت کے سب جابر' چوہدری' سرمایہ دار' کاہن' پروہت' پجاری اور بادشاہ اس کے خلاف صف بستہ ہو گئے۔ اسلام کو پہلے ہی دن سے شدید جدوجہد اور آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ جب ہجرت کے بعد مدینہ میں اسلامی حکومت قائم ہوئی تو ان سب طبقوں کی ناراضگی پہلے سے بھی دوچند ہو گئی اور وہ فوجی طاقت' روپے پیسے' پروپیگنڈے اور سازشوں کے ہتھیاروں سے اسے مٹا دینے پر تل گئے' مگر انہیں ناکامیوں اور مایوسیوں کے سوا کچھ نہ ملا۔

روز آخر تک عقل انسانی یہ تسلیم کرتی رہے گی کہ عظمت انسان حسب ونسل میں نہیں بلکہ اس کے کردار اور اس کے اعمال میں مضمر ہے۔ یہاں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بنی ہاشم اور ابوجہل بھی ایک ہی شاخ کے دو پھول تھے۔ بنی ہاشم اپنے نیک اعمال اور عمدہ اَخلاق کی بدولت خانہ کعبہ کے متولی ٹھہرے جبکہ ابوجہل کافر جیسے لقب سے ملقب ہوا۔ رہتی دنیا تک یہ بات اپنی اس حقیقت پسندانہ دلیل کے عوض اپنے آپ کو منواتی

رہے گی کہ انسان کی عظمت اس کے کردار میں پوشیدہ ہے۔ ہر وہ شخص کسی بھی معاشرے میں معزز سمجھا جاتا ہے جو اچھے کردار کا مالک ہو' انسانیت سے پیار کرتا ہو اور اس کے عمل سے انسان دوستی کا پہلو نمایاں ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اچھے اعمال رکھنے والا شخص دنیا کے کسی بھی خطہ سے تعلق رکھتا ہو مرنے کے بعد بھی دنیا والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوتا ہے۔ اس کے بعد آنے والی نسلیں اس کے انجام دیئے ہوئے کارناموں کو نہ صرف یاد رکھتی ہیں بلکہ اس کی ایجادات سے فائدہ بھی اٹھاتی ہیں۔ ایسے لوگ قوم کا وہ قیمتی سرمایہ ہوتے ہیں جن کا احسان قومیں ہمیشہ یاد رکھتی ہیں۔

یہ بات کہنے میں قطعاً کوئی عار نہیں کہ ایک انگریز محقق بھی جب صداقت تحریر کے لئے کچھ لکھنا چاہتا ہے تو حضرت آدمؑ جیسے نفیس مضمون کا انتخاب کرتا ہے۔ اور اس میں انسانیت کے اس درجہ کی تعریف کرتا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی اس شخص کی معافی ہو گی جو انسان اور انسانیت کے حقوق کا پاسدار ہوگا''۔

کسی بھی خاندان' نسل یا رنگ کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے رسالت مآب سرور کونین ﷺ کا وہ خطبہ یاد آ جاتا ہے جو انہوں نے قرآن پاک کی تکمیل ہو جانے کے بعد آخری حج کے موقع پر ارشاد فرمایا تھا کہ کسی کالے کو کسی گورے پر' کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے' بلکہ سب انسان ایک ہی آدم کی نسل سے ہیں اور آدمؑ کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی۔ حضور اکرم ﷺ کے اس خطبہ میں کسی خاندان کو اعلیٰ اور کسی خاندان کو کم تر قرار نہیں دیا گیا۔ وہ قومیں جنہیں ہم ترقی یافتہ کہتے ہیں حضور اکرم ﷺ کے ارشاد کئے ہوئے اس خطبہ ہی سے فیض یاب ہوئی ہیں۔

یہ حسب و نسل کی باتیں اور یہ اعلیٰ و ادنیٰ کا فرق' یہ سب ان دنیاداروں کی باتیں ہیں جن کی اپنی کوئی بنیادیں نہیں ہوتیں۔ قومیت پرستی و انا پرستی اور حسب و نسب کی تمام پگڈنڈیوں سے ہٹ کر عظمت انسانیت کی شاہراہ اعظم پر چلنے میں ہی کامیابی و کامرانی اور اجتماعی فوز و فلاح ہے۔ مختلف تاریخی حقائق سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ چمن

انسانیت کا پھول بننے کے لئے اعلیٰ خاندان کا فرد ہونا ضروری نہیں ہے' بلکہ اعلیٰ تر کردار اور عمدہ اَخلاق کا مالک ہونا ضروری ہے۔ حسب ونسب کا تعلق تو کسی بھی فرد کے اس نام سے ہوتا ہے جس نام سے وہ معاشرے میں پکارا جاتا ہے' مگر اس کی بقا اس شخص کے اعلیٰ اوصاف' نیکی کے کام یا فلاح و بہبود کے کسی کارنامے میں ہی پوشیدہ ہوتی ہے۔

محمد علی جناح کو قائداعظم کا خطاب ان کے اس اعلیٰ کارنامے پر دیا گیا تھا جو انہوں نے برصغیر کے بکھرے ہوئے مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کر کے سرانجام دیا۔ ان کے اسی کارنامے کی بدولت آج اسلامیانِ پاکستان ایک ملک کے باسی ہونے پر اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں یہ بات بھی دیکھنے میں آئی ہے کہ چور یا ڈاکو ہونے کے لئے غریب' لاچار یا مفلس ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ ہمارے بگڑے ہوئے معاشرے میں اچھے اچھے معزز گھرانوں کے نورِنظر بھی اس فعل کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ تو کیا معاشرہ انہیں چور نہیں سمجھتا؟ یقیناً سمجھتا ہے۔ تبھی تو ہمارے اخبارات انہیں چور لکھتے ہیں' ہماری عدالتیں انہیں سزا سناتی ہیں اور ہمارا معاشرہ انہیں ٹھکرا دیتا ہے۔ نہ صرف معاشرہ بلکہ خاندان کے لوگ بھی ان سے اپنی تعلق داری کو ظاہر نہیں کرتے۔ گویا کہ کردار عظمت انسان کے لئے بیّن دلیل ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں ان لوگوں نے ہی نام پایا ہے جنہوں نے ذات پات سے اوپر اٹھ کر انسانیت کے لئے سوچا اور کچھ کیا ہے۔ یہ دنیا جو دن اور رات کی گردش کرتے ہوئے اپنے محور کے گرد سرگرداں ہے قوموں کے لئے تاریخ بھی مرتب کرتی رہتی ہے۔

اسلام نے بنیادی انسانی حقوق کے زمرہ میں انسان کو مندرجہ ذیل حقوق سے نوازا ہے: جان کی حرمت کا حق' عزت و ناموس کا تحفظ' معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ معاشی تحفظ' عدل و انصاف' نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق' حق مساوات' سیاسی کارفرمائی' شرکت کا حق (مثلاً آزادانہ رائے دہندگی کا حق)' آزادی

کا تحفظ' ملکیت کا تحفظ' عورتوں کی عزت و ناموس کا تحفظ' نجی زندگی کا تحفظ' ظلم و زیادتی کے خلاف احتجاج اور چارہ جوئی کا حق' اظہارِ رائے کی آزادی کا حق' آزادیٔ ضمیر و عقیدہ کا حق' مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق' آزادیٔ اجتماع کا حق' دوسروں کے اعمال سے بریٔ الذمہ ہونے کا حق اور محض شکوک و شبہات پر کوئی کارروائی نہ کئے جانے کا حق۔ یہ حقوق کسی حاکم کی دریا دلی نہیں ہوگی بلکہ خدا اور رسول مقبول ﷺ کی طرف سے دیئے ہوئے ان حقوق کا تحفظ کسی بھی اسلامی ریاست کا اوّلین اور بنیادی فریضہ سمجھا جائے گا۔ جبکہ حقوق امیر و غریب بلا امتیاز رنگ و نسل ایک ہیں تو امتیاز کا معیار تلاش کرنا پڑے گا جو کہ صرف اور صرف تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔

قاضی سلمان منصور پوری اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی مَرد مَرد ہونے کی وجہ سے اور کوئی عورت عورت ذات ہونے کی وجہ سے قابلِ عزت یا قابلِ نفرت نہیں۔ عزت و ذلت کا مدار انسان کے اعمال پر ہے''۔ (الجمال والکمال)

اخوت و مساوات بھی مسلمانوں کا بنیادی حق ہے۔ قرآن مجید اور احادیث کی رو سے سب مسلمان یا مؤمن بھائی بھائی ہیں۔ (الحجرات:۱۰) چنانچہ ایسا کرنا اور سمجھنا حضور ﷺ کی سنت حسنہ ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے مدینہ منورہ میں تشریف لاتے ہی مہاجرین اور انصار میں مواخات کا نظام قائم کر دیا تھا۔ یہ انقلاب آفرین انتظامِ مواخات اخوت و مساوات کا عملی مظاہرہ تھا۔ اس مثالی اور اہم ترین نظامِ مواخات کی افادی اقدار کی غیر معمولی اہمیت کو دیکھ کر مغرب کے ممالک نے بالخصوص کفالت کا نظام قائم کیا ہے۔ لیکن پاکستان میں اخوت و مساوات کے فقدان کے ذمہ دار ہمارے جاگیردار اور وڈیرے ہیں جو حسب و نسب کے دعوے دار ہیں۔

اسلام میں کسی گورے کو کالے پر فوقیت نہیں' نہ عربی کو عجمی پر۔ بلال حبشی کو امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ''سیّدنا'' کہہ کر پکارتے تھے۔ نماز میں صف بندی اس دنیاوی اونچ نیچ کے خاتمہ کی بیّن اور روشن دلیل ہے' جسے اقبال نے ان الفاظ میں واضح کر دیا ؎

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز
نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

اسلام ہی کو یہ شرف حاصل ہے کہ پہلے بھی اور آج بھی معاشرے کا نچلہ طبقہ جسے اونچا طبقہ دھتکار دیتا ہے' وہ اسلام کے دامن امن میں پناہ لیتا ہے۔ جولائی ۸۱ء کے اخبار دیکھئے' جنوبی بھارت میں اونچی ذات کے ہندوؤں کے مظالم سے تنگ آ کر ۱۳۰۰ ہریجنوں نے اسلام قبول کر لیا۔ (نوائے وقت ۴ جولائی ۱۹۸۱ء) مگر اسلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے دامن میں پناہ لینے والوں کو یکساں نظر سے دیکھتا ہے' اونچ نیچ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انتخاب کے بعد پہلے خطبہ میں فرماتے ہیں کہ تمہارا کمزور میری نگاہ میں قوی ہے اور قوی میری نگاہوں میں کمزور ہے۔ دورِ فاروقی میں شام کے گورنر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح ؓ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو رومیوں کے پاس سفیر بنا کر بھیجا۔ شہنشاہ کا دربار اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر آپ نے فرمایا:

''تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے' لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے آپ کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ زنا کرے تو اسے کوڑے لگائے جائیں' چوری کرے تو ہاتھ کاٹ ڈالے جائیں۔ وہ پردے میں نہیں بیٹھتا۔ اپنے آپ کو ہم سے بڑا نہیں سمجھتا۔ مال و دولت میں اس کو ہم پر ترجیح نہیں''۔

(الفاروق' از شبلی نعمانی' ص ۱۲۵' مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز)

اسلامی دعوت کا مرکزی نقطہ لا الٰہ الا اللہ ہے' جس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں' کوئی حاکم' کوئی فریادرس اور کوئی قانون ساز نہیں۔ اس دعوت کو بلند کرنے والے پیغمبر ہر زمانے میں انسانی حریت و مساوات کی اس پکار کو جب بھی لوگوں کے سامنے بلند کرتے رہے بادشاہوں' خود ساختہ معبودوں' چوہدریوں' کاہنوں' پروہتوں اور پجاریوں کی جماعتیں ان پر پل پڑیں۔ ان میں کسی نے بھی اس دعوت کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کیا۔ وہ لوگ جانتے تھے کہ اس پکار کا انجام یہ ہو گا کہ استحصال'

ملوکیت' آمریت اور انسان کے لئے انسان کی غلامی کی تمام شکلیں ختم ہو جائیں گی اور سب انسان ایک سطح پر آ جائیں گے۔ کوئی کسی سے عبادت وعبودیت کا مطالبہ نہ کر سکے گا۔ پس ان کے نزدیک بہتر یہی تھا کہ اس آواز کا گلا گھونٹ دیا جائے۔ بالخصوص سرور انبیاء جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی جس قدر مخالفت ان تمام طبقوں کی طرف سے ہوئی ہے وہ تو رہتی دنیا تک ایک مثال بن چکی ہے۔

ان مخالفین میں ابوجہل اور ابولہب وغیرہ سرفہرست رہے ہیں۔ ذاتی برتری وانا پسندی نے انہیں دائرہ اسلام میں داخل ہونے سے دُور رکھا۔ وہ کیا بات تھی' صرف اور صرف غرور اور خود پسندی۔ حسبی ونسبی غرور میں غرق رہنا ان کی تباہی و بربادی کا سبب بنا' جبکہ دین اسلام میں تو صرف باہمی اخوت' بھائی چارے اور ایک دوسرے کا ہمدرد ہونے کا سبق ملتا ہے۔ جیسا کہ فرمانِ ربّ العزت ہے:

﴿فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا﴾ ''اس کی نوازش سے تم بھائی بھائی ہو گئے''۔

وہ بات جس کی وجہ سے تمام بنی نوعِ انسان آپ کی طرف کھنچتے چلے آئے' آپ کی بے لوث خدا پرستی اور آپ کا تمام ذاتی' خاندانی اور نسلی مفادات سے بالاتر ہونا تھا۔ جب آپ نے یہ آوازہ بلند کیا کہ بلال حبشی سردارانِ عرب سے افضل ہیں اور ہر طرح کی فضیلت اور شرف تقویٰ اور پرہیزگاری کی بناء پر ہے' قریشی اور ہاشمی ہونے کی بناء پر تمہیں کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے' تو قریش اور عرب کے سردار حضور اکرم ﷺ کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

دوسری طرف کارل مارکس اور لینن نے اپنے معاشرے کے مختلف طبقوں کو آپس میں گتھم گتھا کر دیا' لیکن حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات ہیں کہ ((مَنْ لَّمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَلَمْ يُوَقِّرْ كَبِيْرَنَا فَلَيْسَ مِنَّا)) ''جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہیں کرتا اور ہمارے بڑوں کا احترام نہیں کرتا وہ ہم میں سے نہیں''۔

غرض ان حالات میں انسانی مساوات کی آواز رسول خدا ﷺ نے بلند کی۔ اسلام کے بنیادی عقیدۂ توحید کی رو سے بندگی' عبادت اور حاکمیت صرف اللہ کا حق ہے

جو کائنات کا خالق و مالک اور قادر مطلق ہے۔ سب انسان برابر ہیں۔ انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے جیسے انسان کو اپنی غلامی اور بندگی کے داغ سے ملوث کرے۔ یہ آواز چونکہ بالکل نرالی اور انوکھی سمجھی گئی لہٰذا وقت کے سب جابر' چوہدری' سرمایہ دار' کاہن' پروہت' پجاری اور بادشاہ اس کے خلاف صف بستہ ہو گئے۔ اسلام کو پہلے ہی دن سے شدید جدوجہد اور آزمائشوں میں سے گزرنا پڑا۔ رسول اکرم ﷺ جب تشریف لائے تو ساری دنیا بالعموم اور ملک عرب بالخصوص جنگ و جدال میں غرق تھا۔ ذرا ذرا سی بات پر غیر مختتم جنگوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور صدیوں تک جاری رہتا۔ قبائل ایک دوسرے سے ہر وقت ٹکراتے رہتے۔ لوٹ مار کو باعث فخر سمجھا جاتا۔ میدان جنگ میں کسی اخلاقی ضابطے کی پابندی نہ کی جاتی۔ عہد شکنی ایک معمولی بات تھی۔ طاقتور لوگ حیلے بہانے سے کمزوروں پر حملہ آور ہو جاتے اور انہیں تباہ و برباد کر ڈالتے۔ عوام کی عزت و ناموس اور جان و مال ہر وقت خطرے میں رہتے۔ عرب میں تو کوئی باضابطہ مرکزی حکومت بھی نہ تھی اور ہر قبیلے کا اپنا نظامِ حکومت تھا' مگر روم و ایران کی عظیم مہذب حکومتیں بھی جنگ و جدل میں کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہ تھیں۔ ہندوستان کے آریہ حکمران زندگی اور عیش و آرام کو صرف اپنا حق سمجھتے تھے۔ انہوں نے انسانوں کو چار مشہور ذاتوں میں تقسیم کر لیا تھا' برہمن' کھتری' ویش اور شودر۔ پہلے تین طبقے آریاؤں میں سے تھے۔ برہمن مذہبی پروہت اور اجارہ دار تھے' کھتری نظری حقوق کی بناء پر حکومت کے لئے پیدا ہوئے تھے اور ویش صنعت و حرفت اور تجارت و زراعت کرتے تھے۔ چوتھا طبقہ غیر آریائی نسل سے تعلق رکھتا تھا اور اسے کوئی انسانی حقوق حاصل نہ تھے۔ وہ پیدائشی طور پر اچھوت' ذلیل' جہنمی اور قابل نفرت سمجھا جاتا تھا۔ آریاؤں نے اس ملک میں آنے کے بعد آبادیوں کو نذر آتش اور ان کے باشندوں کو تہ تیغ کر دیا تھا۔ چنانچہ ملک کے اصل باشندے جنگلوں اور پہاڑوں کی غاروں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں یہی لوگ دراوڑ' بھیل' سنتھال اور سانس وغیرہ کے نام سے مشہور ہوئے اور انگریزی راج میں انہیں جرائم پیشہ اقوام کی فہرست میں رکھا گیا۔

(باقی صفحہ ۶۴ پر)

امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ

۱۳۵ھ — ۱۹۸ھ

عبدالرشید عراقی

امام عبدالرحمٰن بن مہدیؒ کا شمار اُن ممتاز تبع تابعین میں ہوتا ہے جن کو حدیث نبوی ﷺ میں خاص مہارت حاصل تھی۔ حدیث نبویؐ کے متعلقہ علوم یعنی اصولِ حدیث' جرح وتعدیل' نقد وتمیز اور روایت و درایت میں ان کو مکمل دسترس حاصل تھی' اور ان کا ان علوم میں صاحب کمال ہونے کا بڑے بڑے نامور محدثین کرام اور اربابِ سیر نے اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں:

''عبدالرحمٰن بن مہدی اپنے زمانے میں اصحابِ حدیث کے امام تھے اور حدیث کے تمام علوم و معارف میں انہی پر اعتماد تھا۔''(۱)

امام احمد بن حنبل ان کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ابن مہدی وکیع بن جراح سے زیادہ قابل وثوق ہیں اور ان کے قابل وثوق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اُن کا عہد تدوین وتحریر سے زیادہ قریب ہے۔ یعنی ان کے زمانہ میں حدیث کی تدوین وتحریر کا کام عام طور پر شروع ہو گیا تھا اور وکیع بن جراح کے زمانہ میں ائمہ کرام زیادہ تر زبانی ہی روایات کرتے تھے''۔(۲)

حدیث میں ان کے صاحب کمال ہونے کا بیشتر مؤرخین اسلام اور محدثین عظام نے اعتراف کیا ہے۔ علامہ سمعانی ''کتاب الانساب'' میں لکھتے ہیں:

''عبدالرحمٰن بن مہدی پختہ کار حافظ' صاحب تقویٰ اور جامع حدیث تھے۔ انہوں نے تفقہ پیدا کیا' کتابیں تصنیف کیں اور حدیث کا درس دیا۔ وہ بجز ثقاہت کے کسی اور سے روایت نہیں کرتے تھے اور انہوں نے ایک ایسی جماعت سے روایتیں نقل کی ہیں جس نے صحابہ کرام کو پایا تھا۔''(۳)

امام عبدالرحمٰن کی کنیت ابوسعید تھی۔ والد کا نام مہدی تھا' جو بصرہ کے رہنے والے

تھے اور قبیلہ ازد کے غلام تھے۔ خلافت عباسیہ کے آغاز میں ۱۳۵ھ میں بصرہ میں ان کی ولادت ہوئی۔ (۴)

اساتذہ

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے نامور اساتذہ وشیوخ سے اکتسابِ فیض کیا۔ ان کے اساتذہ میں امام مالک بن انس' شعبہ بن حجاج' سفیان بن عیینہ' سفیان ثوری اور خالد بن دینار جیسے محدثین کرام شامل ہیں۔ (۵)

تلامذہ

امام ابن مہدی کے تلامذہ کی فہرست بھی طویل ہے۔ نامور تلامذہ یہ ہیں: عبداللہ بن مبارک' اسحاق بن راہویہ' احمد بن حنبل' یحییٰ بن معین' علی بن المدینی' امام ذہلی وغیرہ۔ (۶)

فقہ میں کمال

حدیث نبوی ﷺ میں اُن کے صاحبِ کمال ہونے کا اعتراف نامور محدثین کرام نے کیا ہے۔ فقہ میں بھی ان کو کمال حاصل تھا۔ جو شخص روایت اور درایت میں مہارت تامہ رکھتا ہو اور دین کی روح اور اس کے ماخذ ومنبع سے پوری واقفیت رکھتا ہو اس کے تفقہ فی الدین میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔ فقہ میں ان کے صاحبِ کمال ہونے کا بھی علمائے سیر نے اعتراف کیا ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

''ابن مہدی کو فقہ میں کمال حاصل تھا' اور ان کو یحییٰ بن سعید سے زیادہ اس فن میں مہارت حاصل تھی۔'' (۷)

علامہ ابن عماد فرماتے ہیں:

كان فقيها مفتيا عظيم الشان (۸)

''ابن مہدی بہت بڑے فقیہہ اور مفتی تھے۔''

علم وفضل

اربابِ سیر اور علمائے اسلام نے ابن مہدی کے علم وفضل اور تمام علومِ اسلامیہ

میں ان کے جامع العلوم ہونے کا اعتراف کیا ہے۔ حافظ ذہبی نے ان کو ''الحافظ الکبیر'' اور ''العالم الشہیر'' لکھا ہے۔ [۹] حجر نے ان کو حافظ اور امام علم کا لقب دیا ہے۔ [۱۰] نووی لکھتے ہیں کہ ''ابن مہدی کا شمار ان محدثین کرام میں ہوتا ہے کہ ان کے اوپر علم حدیث میں اعتماد کیا جاتا ہے''۔ [۱۱]

سیرت واَخلاق

سیرت واخلاق کے اعتبار سے امام عبدالرحمٰن بن مہدی بلند مرتبہ ومقام کے حامل تھے۔ عبادت وریاضت' زہد وورع' تقویٰ وطہارت' حفظ وضبط' عدالت وثقاہت' امانت ودیانت اور صبر وتوکل میں ان کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ ورع اور تقویٰ میں ان کا مقام بہت بلند تھا۔ کسی چیز میں حرام ہونے کا معمولی سا شبہ ہو جاتا تھا تو اس کو اپنے استعمال میں نہیں لاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے:

''جو چیز تم خدا کی رضا اور خوشنودی کے لئے چھوڑ دو گے اللہ تعالیٰ اس کو تمہارے پاس ضرور واپس کردے گا۔''

یہ بات کہنے کے بعد ابن مہدی نے اپنا ایک واقعہ بیان کیا جس کو حافظ ابن جوزی نے اپنی کتاب ''صفوۃ الصفوۃ'' میں درج کیا ہے۔ ابنِ مہدی فرماتے ہیں:

''میں نے اور میرے بھائی نے مشترکہ تجارت کی جس میں کافی نفع ہوا۔ مگر جب نفع تقسیم ہونے لگا تو اس مال میں کچھ شبہ ہوا' چنانچہ مَیں اپنے حصّے سے دستبردار ہو گیا' مگر خدا کی قدرت دیکھئے کہ میری زندگی میں وہ تمام دولت میرے اور میرے لڑکوں کے پاس آ گئی۔ وہ اس طرح کہ میرے بھائی نے اپنی تین لڑکیوں کی شادی میرے تین لڑکوں سے کردی تھی اور میں نے اپنی لڑکی کی شادی اس کے لڑکے سے کردی۔ اتفاق سے کچھ دن بعد میرے بھائی کا انتقال ہو گیا' ان کے سارے مال اور جائیداد کے وارث میرے والد اور مرحوم بھائی کا لڑکا اور لڑکیاں جو میرے لڑکوں سے بیاہی ہوئی تھیں' بن گئیں۔ کچھ دنوں بعد میرے والد کا بھی انتقال ہو گیا اور کل دولت میرے گھر میں آ گئی۔'' [۱۲]

علماء کو نصیحت

ابن مہدی علماء کو نصیحت کیا کرتے تھے:

''جب آدمی اپنے سے زیادہ صاحب فضل و کمال سے ملے تو اس کی صحبت کو غنیمت سمجھے' اگر اپنے برابر سے ملے تو اس سے استفادہ اور مذاکرہ کی کوشش کرے اور اگر اپنے سے کمتر آدمی سے ملے تو اس کے ساتھ تواضع سے پیش آئے اور اس کو اپنے علم و فضل سے فائدہ پہنچائے۔''(۱۳)

عقائد میں تشدد

اپنے خیالات و عقائد میں نہایت متشدد تھے' فرمایا کرتے تھے:

''اگر مجھے اقتدار حاصل ہوتا تو قرآن کو مخلوق کہنے والوں کی گردن اڑا دیتا اور پھر اُن کی لاشوں کو دجلہ میں پھنکوا دیتا۔''(۱۴)

وفات

امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے ۶۳ سال کی عمر میں جمادی الاخریٰ ۱۹۸ھ میں بصرہ میں انتقال کیا۔(۱۵)

حواشی

۱) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۱' ص ۳۰۵
۲) تاریخ بغداد' ج ۱۰' ص ۲۴۵
۳) سمعانی' کتاب الانساب' ص ۴۹۶
۴) خطیب بغدادی' خطیب بغداد' ج ۱۰' ص ۲۴۵
۵) ابن حجر۔ تہذیب الاتہذیب' ج ۶' ص ۲۸۰
۶) مجیب اللہ ندوی' تبع تابعین' ج ۱' ص ۳۵۳
۷) ابن حجر' تہذیب التہذیب' ج ۴' ص ۲۸۱
۸) ابنِ حماد' شذرات الذہب' ج ۱' ص ۳۵۵
۹) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۲' ص ۳۰۲
۱۰) ابنِ حجر' تہذیب التہذیب' ج ۶' ص ۲۸۱
۱۱) نووی' تہذیب الاسماء' ج ۱' ص ۳۰۵
۱۲) ابنِ جوزی' صفوۃ الصفوۃ' ج ۴' ص ۴
۱۳) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۱' ص ۳۰۳
۱۴) ذہبی' تذکرۃ الحفاظ' ج ۱' ص ۳۰۳
۱۵) سعید احمد اکبر آبادی' غلامانِ اسلام' ص ۳۲۱

تعارف وتبصرۂ کتب

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

——— (۱) ———

نام کتاب : شوقِ حرم
مصنف : عتیق الرحمن صدیقی
ضخامت : 100 صفحات
قیمت : 45 روپے
شائع کردہ: : نور اسلام اکیڈمی' پوسٹ بکس 5166' ماڈل ٹاؤن لاہور
ملنے کا پتہ : مکتبہ نور اسلام' رحمٰن مارکیٹ' غزنی سٹریٹ' اردو بازار لاہور

ہر صاحب استطاعت مسلمان پر حج فرض ہے۔ اگر چہ کچھ قسمت کے مارے استطاعت کے باوجود بھی اس رکن اسلام کی ادائیگی سے محروم رہتے ہیں' مگر اکثریت کا حال یہ ہے کہ وہ ہمہ وقت اس سفر سعید کا ارمان لئے وقت کا انتظار کرتے ہیں اور کچھ لوگ تو ایسے ہیں بھی ہیں جو اس مقدس سفر کے لئے ہر سال تیار رہتے ہیں اور زندگی میں کئی دفعہ حج اور عمرہ کی سعادت حاصل کرتے ہیں۔ ہر سال اتنی بڑی تعداد میں لوگ حج پر جانے کے لئے درخواستیں جمع کراتے ہیں کہ قرعہ اندازی کرنا پڑتی ہے۔ بہر حال سفر تو سفر ہی ہوتا ہے' مگر یہ سفر جذباتِ عقیدت سے معمور' روح میں ترفع اور جذبات میں تقدس لئے ہوئے ہوتا ہے۔ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق عروج حاصل کرتا اور باطنی کیف سے بہرہ ور ہوتا ہے۔

اس مبارک سفر سے واپسی پر بہت سے زائرین نے اپنے تجربات قلم بند کئے ہیں۔ ہر شخص کا اپنا انداز ہے۔ یہ سلسلہ چل رہا ہے اور ''شوق حرم'' بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے حج کی درخواست جمع کرانے سے لے کر فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد واپس گھر پہنچنے تک کے حالات کو اپنے انداز میں حوالۂ

قرطاس کیا ہے۔اس میں محبت کے جذبات' عقیدت کی کیفیت اور سفر کی روداد بیان کر دی گئی ہے۔ واردات قلبی اس انداز میں تحریر کئے ہیں کہ ''شوق حرم'' کا پڑھنے والا گزشتہ لمحات پر حسرت وافسوس کرتا ہوا سفر حرم کے لئے تیاری کے جذبات لئے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوتا ہے کہ اسے بھی زیارت حرمین شریفین کی سعادت نصیب ہو۔

پہلی دفعہ حج پر جانے والوں کے لئے اس کتاب میں خاصی راہنمائی موجود ہے' کیونکہ مصنف نے ترتیب وار سارے ارکان حج کی ادائیگی کا ذکر کرتے ہوئے قیام مدینۃ النبی کی کیفیت اور زیارات شہر مقدس کو بھی بیان کیا ہے۔آمد ورفت کے اس سفر اور قیام حرمین کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کر کے انتظامات کو مزید بہتر بنانے کے لئے تجاویز بھی دی ہیں۔اس کے علاوہ حجاج کرام کو ضابطۂ اخلاق کی پابندی کرنے کی بھی تلقین کی ہے تاکہ ایک حاجی دوسروں کے لئے کسی بھی انداز میں تکلیف کا باعث نہ بنے۔عازمین حج کے علاوہ عام قارئین کے لئے بھی اس کتاب میں دل چسپی کا مواد ہے۔

کتاب میں کتابت کی چند ایک اغلاط بھی ہیں۔اس کے علاوہ کتاب کے صفحہ ۵۷ پر شہر مکّہ کے بارے میں لکھا ہے ''قرآن مبین نے جسے مکّہ بھی کہا ہے اور بکّہ بھی'' حالانکہ قرآن کریم میں مکّہ کو ''بکّہ'' ہی کہا گیا ہے مکّہ نہیں۔کتاب خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ مزین ہے۔سفید کاغذ پر معیاری لکھائی نے کتاب کے حسن ظاہری میں بھی خوب خوب اضافہ کر دیا ہے۔نور اسلام اکیڈمی کی مطبوعات میں یہ ایک اچھا اضافہ ہے۔

——(۲)——

نام کتاب : شیطان اور اس کا دجل وفریب
مصنفہ : پروفیسر بسینہ خٹک
ضخامت : 223 صفحات
قیمت : 140 روپے
ملنے کا پتہ : صفہ پبلشرز' 19۔اے' ایبٹ روڈ' لاہور

شیطان بنی نوع انسان کا ازلی اور ابدی دشمن ہے۔اس بدترین دشمن کا مشن یہ

ہے کہ وہ انسانوں کو گمراہی میں مبتلا کر کے جہنم کا ایندھن بنا دے۔ اس نے اپنے مشن کی تکمیل کے لئے صلاحیتیں اور وقت لے رکھا ہے۔ کوئی انسان بھی اس کی زد سے باہر نہیں۔ وہ اللہ کے برگزیدہ بندوں انبیاء و رسل پر بھی وار کرنے سے نہیں چوکتا۔ اس کا طریق سبز باغ دکھانا' نقد منافع کی ترغیب دینا' برے اعمال کو اچھا کر کے دکھانا' آخرت کی فکر سے دور رکھنا' لہو ولعب اور خدا فراموشی میں مگن رکھنا ہے۔ قرآن کریم میں اس کو الغَرور کہا گیا ہے یعنی انتہائی دھوکے باز۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ شیطان خون کی طرح انسان کی رگوں میں دوڑتا ہے یعنی اس کا حملہ انتہائی چابکدستی کے ساتھ ہوتا ہے اور اکثر وہ اس قدر خوشنما ہوتا ہے کہ انسان فوراً ہی اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔

شیطان کے انہی حربوں کا تفصیلی ذکر مصنفہ نے اس کتاب میں کیا ہے۔ قرآن وحدیث کے حوالہ جات سے اپنے دلائل وشواہد کو مضبوط کیا گیا ہے۔ قاری کے لئے اس میں بہت بڑی تنبیہہ ہے کہ وہ ہر وقت چوکنا رہے اور اپنا محاسبہ کرتا رہے کہ کسی موقعہ پر بھی غیر محسوس انداز میں شیطان اس کو دھوکہ دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

اس کتاب میں بتایا گیا ہے کہ شیطان نے انبیاء کو بھی دھوکہ دینا چاہا۔ اس بات سے ہر انسان کو سبق ملتا ہے کہ جب اللہ کے برگزیدہ بندے بھی شیطان کے حملہ سے محفوظ نہیں تو ہم کیسے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ شیطان کے دو بڑے حربے حسد اور حرص ہیں جن میں وہ انسان کو بڑی آسانی کے ساتھ مبتلا کر دیتا ہے۔ اسی طرح بدعات کو وہ خوش نما عمل کی صورت میں پیش کر کے انسان کو گمراہی کی تاریکی میں دھکیل دیتا ہے۔ ایک بڑا دھوکہ وہ یہ دیتا ہے کہ تم اللہ کے ماننے والے ہو جو غفور ورحیم ہے' وہ تمہارے سارے گناہوں کو بخش دے گا' پھر پیغمبر کی شفاعت سے تو ضرور ہی بخشش ہو جائے گی لہٰذا اعمال صالحہ' نماز' روزہ' رزق حلال کی تلاش اور حقوق العباد کی فکر کی مشقت میں پڑنا کچھ ضروری نہیں۔

مصنفہ نے یاد دلایا ہے کہ جوا' شراب اور مشرکانہ رسوم شیطانی عمل ہیں۔ اس کے علاوہ شیطان انسان کو مال کی محبت میں مبتلا کر کے انفاق فی سبیل اللہ اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے باز رکھتا ہے۔ وہ رقص وسرود' فحش و بے حیائی کو آرٹ اور کلچر کا نام دیتا

ہے۔ رشوت کو چائے پانی کے نام سے جائز بتاتا ہے۔ بچوں کے مستقبل کو تابناک بنانے کے لئے اندھا دھند کوشش کرنے کی ترغیب دیتا ہے تاکہ نہ صرف اولاد کا حقیقی مستقبل تباہ ہو جائے بلکہ خود بھی جہنم میں جانے کی شرائط پوری کر دے۔

مصنفہ نے بڑی محنت کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا ہے اور بتایا ہے کہ شیطان کے خوشنما دھوکے سے ہر وقت چوکنا رہنا ضروری ہے کیونکہ اس کی دلفریب باتوں میں آ کر جب انسان اپنی گمراہی کا ذمہ دار شیطان کو ٹھہرائے گا تو شیطان صاف صاف کہہ دے گا کہ ''مجھے تمہارے اوپر کوئی اختیار نہ تھا' ہاں میں نے تم کو صرف دعوت دی تھی جو تم نے خود قبول کر لی۔ پس اب مجھے ملامت نہ کرو بلکہ اپنے آپ ہی کو ملامت کرو''۔

کتاب ہر مسلمان کے پڑھنے کی ہے کیونکہ کافر تو پہلے ہی دولت ایمان سے خالی ہیں۔ مسلمانوں کو شیطان کے دجل وفریب سے محفوظ رہنے کی شدید ضرورت ہے تاکہ ان کا ایمان' اسلام اور عمل صالح مقبول ومنظور ہو کر نجات اخروی کا باعث بن سکیں۔

کتاب میں کمپوزنگ کی بہت سی اغلاط ہیں' جنہیں اگلے ایڈیشن میں درست کرنے کی ضرورت ہے۔ کتاب مجلد اور ٹائٹل دیدہ زیب ہے۔

——— (۳) ———

نام کتاب : آستینوں کے بُت

مصنف : محمد فاروق شیخ

ضخامت : 86 صفحات

قیمت : 45 روپے

ملنے کا پتہ : کرن میٹل ویئرز' میاں سانسی سٹریٹ لنک شیخوپورہ روڈ' گوجرانوالہ

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ فرقہ پرستی اسلام کے حسین چہرے پر ایک بدنما داغ ہے۔ جس دین کی نمایاں تعلیم اتحاد واتفاق ہو اس دین کے اندر گروہ بندیاں کسی طور پر قابل برداشت نہیں ہو سکتیں۔ آج مسلمان مختلف فرقوں اور مسلکوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نہ صرف نفرت کرتا ہے بلکہ اسے نیچا دکھانے میں کوشاں ہے۔ ہر گروہ کے مدارس طلبہ کو اپنے افکار ونظریات کی ثقاہت کا درس دیتے اور دوسروں کے

نقائص از بر کراتے ہیں۔ اس طرح اسلام کی ترویج و اشاعت اور سربلندی کا کام پس پشت چلا گیا ہے اور مسالک کے مخصوص مسائل کو عام کرنے پر پوری تندہی سے کام ہو رہا ہے۔ اسی صورت حال نے مصنف کو قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔

مصنف نے اس کتاب میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہر طبقے کے علماء اس نازک صورتِ حال کے پیش نظر گروہی اور مسلکی اختلافات سے صرف نظر کریں اور کتاب و سنّت کی محکم، مستند اور غیر متنازعہ تعلیمات کو عام کرنے میں بھرپور کردار ادا کریں۔ اُمت کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھا کرنے کے سلسلہ میں مصنف نے چند شخصیات کی مساعی کو سراہا ہے جن کے علم و عمل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اتحادِ اُمت کے کام کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ ان شخصیات میں امام ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، علامہ اقبال، ابوالحسن علی ندوی، ابوالاعلیٰ مودودی، سیّد جمال الدین افغانی اور مولانا الطاف حسین حالی رحمہم اللہ تعالیٰ نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ وحدتِ اُمت مسلمہ کے سلسلہ میں فکر اقبال خاص طور پر صحیح سمت کی طرف راہنمائی کرتا ہے جو نہایت مؤثر انداز میں فرقہ بندی کا ردّ کرتا اور روئے ارضی کے تمام مسلمانوں کو رشتۂ اخوت مضبوط کرنے کا درس دیتا ہے۔

یہ کتاب وقت کی ضرورت اور فکر انگیز ہے۔ خاص طور پر واعظ اور خطیب حضرات اور مختلف مسالک کے ذمہ دار افراد کو اس کتاب کے ذریعے صحیح سمت متعین کرنے کے لئے کہا گیا ہے، یعنی علمائے اُمت کو مسالک کی ترویج و اشاعت کی بجائے اسلام کی پیش رفت میں کوشاں ہونا چاہئے۔

کتاب مضبوط جلد میں محفوظ کی گئی ہے، تاہم کمپوزنگ کی بے شمار غلطیاں ہیں جن میں کچھ غلطیاں تو فاش نوعیت کی ہیں، جو مطالعہ کرنے والے کے لئے تکدر خاطر کا موجب ہیں۔ بعض آیات کے حوالہ جات میں بھی ابہام ہے۔ نیز کچھ آیات کے ترجمہ میں غیر محتاط انداز بھی نظر آتا ہے۔

بقیہ: ذات پات کی نفسیات اور اسلام

ذات پات کا امتیاز اور رنگ و نسل کا غرور آج بھی ہندوستان کی ہندو سوسائٹی کا جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر ہندو کو راکشس (وحشی' ڈاکو' لٹیرا' رہزن اور قابل نفرت) خیال کیا جاتا ہے۔ بڑے بڑے مصلحین کی کوششوں اور جدید تعلیم و تہذیب کے باوجود بھی اس ہندو ذہنیت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ (جاری ہے)

بقیہ: بچوں کی تعلیم و تربیت

کے لئے کمرے کے ایک کونے میں پکڑ کر کھڑا کر دیا جائے' اس کا مُنہ دوسری طرف کر دیا جائے' اس کی طرف کوئی ملتفت نہ ہو اور خاموشی اور متانت سے اپنے کام میں مشغول رہا جائے۔ اس کے شور و غل پر کوئی توجہ نہ دی جائے جب تک کہ وہ اپنے اس نفسیاتی عمل سے باہر نہ نکل آئے۔ لوگوں کی موجودگی میں اگر ایسا دَورہ پڑے تو اس کی وجہ بھوک' تھکاوٹ' والدین سے بہت زیادہ توقعات' یا کھلونوں یا کھیل سے دُور کرنا بھی ہوسکتا ہے۔

۱۵) مشکل بچے کی صورت میں اگر حالات قابو سے باہر ہو گئے ہوں تو ایسی صورت میں محلے کے کسی خیر خواہ سے مدد حاصل کرنا ضروری ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ والدین بھی اپنے رویئے پر نظر ثانی کریں جس کی وجہ سے وہ بچے کو منظم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

ہے ـــــ کہ خود نخچیر کے دل میں ہو پیدا ذوقِ نخچیری!ـــــ اصل رنج تو احساسِ زیاں کے فقدان کا ہے کہ اس بے کسی ولاچاری اور ذلت ورسوائی کے باوجود ہم بحیثیت قوم مطمئن اور ''آسودہ'' دکھائی دیتے ہیں۔ع حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

''شیطان بزرگ'' اور فرعونِ وقت امریکہ کے جبر وقہر اور ملت اسلامیہ کی لاچاری کا یہ مظہر بھی نہایت افسوسناک اور شرمناک ہے کہ ایک اخباری اطلاع کے مطابق امریکہ کی جانب سے جاری فرمان شاہی کی تاب نہ لا کر سعودی حکومت' جسے ملت اسلامیہ کے مرکز ومحور کی حیثیت حاصل ہے' مدینہ یونیورسٹی کے نام کو بدلنے پر سنجیدگی سے غور کر رہی ہے کہ اس کے نام میں شامل ''الاسلامیہ'' کا لفظ امریکہ کے خیال کے مطابق یونیورسٹی کے ماحول میں شدت پسندی اور دہشت گردی کے فروغ کا موجب بن رہا ہے۔ مزید برآں امریکی دباؤ پر سعودی یونیورسٹیوں کے نصاب میں تبدیلی کے عمل کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ جی ہاں' یہ سب کچھ ایک ''آزاد'' اسلامی ملک میں ہو رہا ہے۔

ایران نے ابتداء میں امریکہ کے جبر وقہر کو خاطر میں نہ لانے اور اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہونے کا عندیہ دیا تھا لیکن تابہ کے۔ اکیلا ایران' امریکی عفریت کی درندگی کا کہاں تک مقابلہ کر سکتا ہے! اس کے لہجے کی حالیہ کمزوری اور بعض غیر ضروری اقدامات اس کے عزم وہمت کی کمی کی چغلی کھا رہے ہیں۔ ادھر عراق پر کسی بھی وقت امریکی حملہ ہو سکتا ہے۔ امریکہ اپنی مرتب کردہ لسٹ کے مطابق یکے بعد دیگرے مسلمان ممالک کو نوالہ تر بنا رہا ہے اور پورے عالم اسلام پر ایک بے حسی' جمود اور بے کسی کی کیفیت طاری ہے۔ ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم!

آج پورے عالم اسلام کی یہ کیفیت کیوں ہے؟ اس کا مختصر جواب علامہ اقبال کے الفاظ میں تو یہی ہو گا کہ ؎

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

سچی بات یہ ہے کہ پوری ملت اسلامیہ نے اللہ اور اس کے دین سے بے وفائی کے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ پچھلی صدی کے وسط میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانانِ عالم کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے انہیں بھرپور موقع عنایت فرمایا تھا کہ یورپی اقوام کی غلامی کے شکنجے سے انہیں آزادی ملی تھی۔ سورۂ یونس کی آیت کے مطابق کہ ''پھر اے مسلمانو! ہم نے تمہیں زمین میں خلافت ونیابت (غلبہ واقتدار) عطا فرمایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل کرتے ہو''۔

اللہ نے ہمیں یعنی عالمی ملت اسلامیہ کو ایک بھرپور موقع عطا فرمایا تھا' لیکن ہم نے اللہ کو حاکم اعلیٰ اور لائق عبادت ماننے کی بجائے امریکہ' روس اور برطانیہ کو اپنا قبلہ وکعبہ بنانے کو ترجیح دی۔ آج نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ ذلت ومسکنت کا عذاب یا دوسرے لفظوں میں ''جرم ضعیفی'' کی سزا آج پوری امت پر مسلط ہے۔ اس صورت حال کا علاج بھی حکیم الامت نے بڑی عمدگی سے تجویز کیا تھا کہ ؎

ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اُوست اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!

اللہ کی رسی قرآن حکیم کو مضبوطی سے تھامنا' اس کی تعلیمات پر انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر عمل پیرا ہونا' اس قرآن کی بنیاد پر متحد ومتفق ہو کر بنیان مرصوص بننا اور اس کے عطا کردہ نظام عدل اجتماعی یعنی نظام خلافت کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنے میں ہی ہماری عافیت پوشیدہ ہے ـــــ دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی!○○